آگ کے ہمسا
احمد یوسف

آگ کے ہمسائے

(یہ کتاب بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے)

پہلی اشاعت: ۱۹۸۰ء
تعداد: ایک ہزار
صفحات: ایک سو چوالیس
خوشنویس: ابوالکلام عزیزی
مطبع: پٹنہ لیتھو پریس۔ رمنہ لین۔ پٹنہ
قیمت: پندرہ روپے

ملنے کے پتے:
بک ایمپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
کمرشیل ایمپوریم، صدر گلی، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸
کلچرل اکیڈیمی، رینہ ہاؤس، جگ جیون روڈ، گیا
شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الٰہ آباد۔

شمّی کے نام

جو تم سنو تو قصۂ غم مختصر بھی ہے

فہرست

میری باتیں

سچ پوچھئے تو حال بھی وہی قصے سنا رہا ہے، جو ماضی نے سنائے تھے۔ وہی خون کی پیاسی تلواریں، وہی غیظ و غضب میں ڈوبی آنکھیں، وہی گردن جو غرور و نخوت سے اکڑی ہے اور وہی گردن جو سیکڑوں سال کے بوجھ سے جھکی، ستم کی تلوار سہنے کو تیار ہے۔

یہ ضرور ہے کہ ان قصوں نے آج خوشنما ملبوسات زیب تن کر لئے ہیں۔ بستیوں میں رونق آگئی ہے، شور اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے دباؤ سے ہمارے دل بیٹھے جا رہے ہیں اور رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے کہ اس کا ساتھ دیتے دیتے ہماری سانسیں اکھڑ جاتی ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، قصے کا بنیادی عنصر وہی ہے جو کل تھا،

وہی تلواریں ——

وہی خاک و خوں میں لتھڑے جسم ——

اور وہی موت کا جشن مناتا ہوا غول بیابانی ——

تو کیا ہم اسے توسیع کا عمل کہیں گے؟

غنیمت یہ ہے کہ ابھی آگ بجھی نہیں ہے، اور داستان گو سے برسرِ عام یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ پچھلی داستان سُنا چکا ہو، تو اب آگے کی سُنائیے۔ اور یہ ایک فالِ نیک ہے۔

احمد یوسف

چراغ کشتہ

غالباً خاکسار کو آپ نے پہچانا نہیں۔ سچ فرمایا آپ نے۔ بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے۔
بچپن میں تو آپ حسام الدین سے ملنے ہر دوسرے تیسرے دن آیا کرتے تھے در اصل بچوں کی صحبت میں
میرا بہت دل لگتا ہے۔ کل بھی لگتا تھا اور آج بھی لگتا ہے اس لئے جو بچے آج جوان ہو گئے انھیں
بھی پہچانتا ہوں اور جو بچے کل جوان ہوئے تھے اور آج ادھیڑ ہو چکے ہیں انھیں بھی پہچانتا ہوں۔ اس گھر کی
تین پشتوں کو گود میں کھلا چکا ہوں۔

یہ حسام الدین کا بچہ ہے۔ بیٹے یہ چچا میاں تمہارے انھیں سلام کرو۔ میری عمر کے متعلق دریافت
کیا آپ نے۔ یہی کوئی ستر بہتر کے لگ بھگ ہو گی۔ میاں اگلے وقتوں کا کھایا پیا کام آ رہا ہے۔
ورنہ وہ غذا اب کسے نصیب — اگلے وقتوں کی باتیں تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی
ہیں — کیا آسودگی کا زمانہ تھا — ہر چیز میں برکت تھی — اب تو جیسے برکت ہی ختم ہو گئی ہے۔ سچ پوچھیے
تو لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا۔ اس لئے ملاوٹ کا بیوپار ہی نہیں ہوتا تھا — اور آج جو یہ نئی نئی
بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ میرے خیال میں تو میاں یہ سب ملاوٹ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ہمارے وقتوں میں

ہر چیز خالص تھی۔ لیکن آج تو میاں یہ عالم ہے کہ بغیر ملاوٹ کے کوئی بیوپار ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی بھی اب خالص نہیں ملتا ہے۔ آپ آج کے آدمی ہیں آپ کو یہ باتیں ناگوار گذرینگی لیکن حقیقت تو کچھ ایسی ہی ہے میاں۔

حسام الدین کالج گئے ہوئے ہیں۔۔ آپ آرام سے بیٹھیں آپ ہی کا گھر ہے۔ کیا وقت ہوا ہے آپ کی گھڑی میں۔ بس اب ان کے آنے کا وقت ہو ہی چلا۔

آپ نے تو اس کوٹھی کے اچھے دن دیکھے ہیں۔ میاں چونکنے کی بات نہیں ہے۔ یہ سب قدرت کا نظام ہے، ہم آپ تو مجبور محض ہیں۔

پروفیسر صاحب تو یاد ہونگے آپ کو۔۔ جی ہاں پروفیسر حنیف ہی کے متعلق عرض کر رہا ہوں۔ کیا وضعدار آدمی تھے۔ کیا شان بان تھی ان کی۔ بس یوں سمجھئے کہ اگلی شرافت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ میری حیثیت کیا تھی میاں۔ معمولی خدمتگار تھا۔ ان کی جوتیوں کی خاک تھا۔ پر اُن کی زندگی میں میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں ایک معمولی خدمتگار ہوں۔ علم انسان کو بہت بلند کر دیتا ہے میاں۔ اتنا بلند کہ وہ ہر چیز کو بلند دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔

ارے میاں آپ تو کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ معمولی سا آدمی ہوں۔ معمولی سی باتیں کرتا ہوں۔ فلسفہ کہاں ہے۔۔ یہ سب پروفیسر صاحب کی دین ہے۔ آپ جیسے معزز لوگوں سے دو دو باتیں کر لیتا ہوں۔ شرفاء کی مجلس کے آداب جانتا ہوں۔ جی ہاں وہ تو دنیا کو بہت کچھ دے کر گئے، پر ہم کیا دے کر جائیں گے میاں۔ ہمارے پاس کیا دھرا ہے۔

دس سال کی عمر تھی میری جب میں یہاں آیا تھا۔ میری والدہ نے پروفیسر صاحب کو گود میں کھلایا تھا۔ اسی سال میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ جی وہ نواب امتیاز حسین صاحب کے یہاں خدمتگار تھے۔ آپ نے تو "امتیاز منزل" دیکھی ہوگی۔۔۔ بڑا دربار تھا صاحب وہ بھی۔۔۔ ہاں اب تو پہلی سی بات کہیں نہیں رہی۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ مجھے یہیں لے آئیں۔ ہر چند نواب صاحب نے کہا بھی کہ وہ مجھے والد کی جگہ پر بحال کر لیں گے۔ وہ بھی بڑے مخیر تھے۔ لیکن والدہ نہ مانیں۔ میری قسمت اچھی تھی کہ یہاں آ گیا اور بڑے باکمالوں کی صحبت میں زندگی گذار دی۔۔۔

پروفیسر صاحب بس یوں سمجھئے کہ مجھ سے کوئی آٹھ دس سال بڑے ہوں گے۔ تھے تو میرے آقا۔ لیکن برتاؤ بالکل بڑے بھائیوں جیسا تھا چنانچہ لطیف میاں اور شریف میاں نے مجھے ہمیشہ "چچا" ہی کہا۔

اجی میاں ولایت جانے لگے تو لطیف میاں اور شریف میاں دونوں بہت چھوٹے تھے، بس دو چار سال کا فرق ہو گا دونوں بھائیوں میں ـــ ان دونوں کو میرے سپرد کر گئے تھے ـــ یہ مزاج تھا اگلے لوگوں کا ـــ اللہ اللہ ـــ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

یہ تصویر ولایت میں کھنچوائی تھی۔ کیا وجیہہ آدمی تھے۔ کیا بارعب چہرہ پایا تھا۔ نور اللہ مرقدہ۔ اور چہرہ تو میاں دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ میرے محسن، میرے آقا۔ آپ کی بدولت میں نے کیسے کیسے عیش کئے ـــ جب بھی پروفیسر صاحب کا ذکر آتا ہے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ چلے گئے جن کی دنیا کو ضرورت تھی اور ہم رہ گئے جو دنیا کے لئے ایک بے ضرورت سی شے ہیں۔ فطرت کا مذاق ہے یہ بھی۔

اب کیا جسم رہے گا۔ جوانی میں بڑا کس بل تھا۔ اب تو نہ وہ غذا ہے نہ وہ پانی ہے۔ جی ہاں پانی میں بھی بڑا فرق آگیا ہے۔

جو کچھ کھانے کو ملتا ہے کھا لیتا ہوں اور جو کچھ پینے کو ملتا ہے پی لیتا ہوں۔ یہ بھی خدا کی مہربانی ہے۔ سارے شوق تو میاں برسوں پیچھے چھوٹ گئے۔ ارے کیا پوچھتے ہیں ـــ اب تو دیسی کپڑوں کا دور دورہ ہے، میری جوانی کے دنوں میں تو بس باہر ہی کے کپڑے چلتے تھے۔ کوئی بیس سال کی عمر ہو گی میری جب پروفیسر صاحب ولایت سے واپس آئے تھے۔ میں نے سوال کیا میرے لئے کیا لائے ہیں۔ کہنے لگے جو مانگو حاضر ہے۔ میں نے للچائی نظروں سے ان کے سوٹ کو دیکھا ـــ میاں سچ کہتا ہوں بہترین ولایت کا سلا سوٹ اسی وقت اتار کر دے دیا۔ حالانکہ بڑے خوش پوشاک آدمی تھے اور کپڑوں سے تو جیسے عشق کرتے تھے۔ لیکن میں کہوں اور وہ نہ دیں۔ زندگی بھر انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ میرا دل میلا نہ ہو۔ دراصل میری ماں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے خیال رکھنا۔ بڑی عزت کرتے تھے وہ ان کی ـــ ان کے ولایت جانے سے کوئی دو سال پہلے مری تھیں۔ میاں یہ اگلے لوگوں کی باتیں تھیں جو ان کے ساتھ چلی گئیں۔ میری والدہ سے انھوں نے جو وعدہ کیا تھا اسے

زندگی بھر نباہنے کی کوشش کی۔ اب ان باتوں کو کون باور کرے گا۔

یہ کوٹھی پروفیسر صاحب نے ولایت سے واپس آ کر بنوائی تھی۔ یہاں پہلے ایک پرانے طرز کی عمارت تھی۔ ہر بڑا آدمی اپنی تعمیر آپ کرتا ہے۔ یہ نشست گاہ پروفیسر صاحب کے زمانے میں دیکھنے کی چیز تھی۔ بہت سارے نوادرات جمع کر رکھے تھے انھوں نے۔ کچھ چیزیں لطیف میاں کے یہاں ہیں کچھ شریف میاں کے یہاں اور کچھ یہیں مقفل کر دی گئی ہیں۔ ارے میاں یہاں میں نے ایسی ایسی جلیل القدر ہستیوں کو زانوئے ادب تہہ کرتے دیکھا ہے کہ حیرت ہوتی تھی ــــ یوں سمجھئے کہ یہاں سے علم کا ایک چشمہ جاری تھا۔ پیسوں کی کمی نہیں تھی ــــ حاکم قدر دان تھا اور ہر شخص کے مرتبے کو پہچانتا تھا۔ ایسا نادر روزگار روز روز تو پیدا ہونے سے رہا ــــ خوب کمایا اور خوب خرچ کیا ــــ مجھ سے تو کچھ چھپا نہیں تھا میاں ــــ میں جانتا ہوں کہ ان کے دم سے کتنوں کی پرورش ہوتی تھی۔ یتیموں اور بیواؤں کے لئے تو ہر مہینے کی تنخواہ سے ایک اچھی خاصی رقم نکال لیتے تھے اور یہی خاکسار سبھوں کو پہنچاتا تھا۔ کمال تو یہ ہے میاں کہ لطیف میاں اور شریف میاں کو بھی آج تک ان باتوں کی خبر نہیں ہے۔ اللہ کی راہ پر خرچ کرتے تھے، نام و نمود سے تو کوسوں دور بھاگتے تھے۔

پروفیسر صاحب کے زمانے میں کچھ نہ پوچھئے کیا عروج تھا اس کوٹھی کا۔ کتنے لوگ تھے یہاں۔ دراصل وہ پورے خاندان کو سمیٹ کر رکھنا جانتے تھے۔ ان کی زندگی میں سبھی ایک مرکز پر جمع تھے، لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی پورے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا ــــ خاندان تو خاندان کے بزرگ سے قائم رہتا ہے۔ کیا عزت تھی۔ کیا وقار تھا ــــ سچ کہہ رہے ہیں زمانہ بھی بہت بدل گیا ــــ یہ جو پھولوں کے تختے دیکھ رہے ہیں، انھیں کے ہاتھ کے لگائے ہوئے ہیں۔ خود بھی مجسم باغ و بہار تھے۔

پروفیسر صاحب خلد آشیانی ہو گئے۔ میں بھی سفر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔

لطیف میاں وکالت کرتے ہیں ــــ شریف میاں پروفیسر ہیں۔ دونوں نے شہر چھوڑ دیا ــــ یہ جگہ تو اب ویران سی ہوتی جاتی ہے میاں۔

شریف میاں کے متعلق پوچھ رہے ہیں، کیا کہنے ہیں ان کے۔ بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ خود بھی کوئی دن میں باپ کے مرتبے پر پہنچ جائیں گے۔ بڑا نام ہے ان کا۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے

کا بچپن سے شوق ہے۔ پروفیسر صاحب تو انہیں کتابوں کا کیڑا کہا کرتے تھے۔ پڑھ پڑھ کر صحت خراب کر لی اپنی۔ مگر وہ بھی علم کے دریا ہیں۔ گود میں کھلایا ہے ان بچوں کو، اب تو ادھیڑ ہو گئے۔ جی ہاں کبھی کبھار تو آجاتے ہیں۔ لطیف میاں ہر خط میں بڑے اصرار سے بلاتے ہیں۔ شریف میاں بھی برابر کہتے رہتے ہیں کہ میرے یہاں آجاؤ۔ میاں اب اس بڑھاپے میں کہاں جائیں۔ اسی گھر میں جوان ہوئے، اسی میں ادھیڑ ہوئے، اسی میں بوڑھے ہوئے، اب تو میاں اس گھر سے مر ہی کر نکلیں گے۔ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں اس گھر سے۔

جی ہاں — بال بچے سب ہی ہیں، مگر پیری میں کون ساتھ دیتا ہے۔ بڑا سہارا ہے اس گھر کا۔ میری بیوی کو مرے کوئی دس سال سے بھی زیادہ ہو گئے۔ یہ جو اس کوٹھی کی پشت پر پروفیسر صاحب کا آبائی قبرستان ہے، وہیں وہ نیک بخت مدفون ہے۔

میاں اب تو حسام الدین کی ذات بڑی غنیمت ہے۔ پروفیسر صاحب کے پوتوں میں خاندانی روایات کو کسی نہ کسی حد تک اسی نے قائم رکھا ہے۔ بڑا ہی سعادت مند لڑکا ہے۔ میرا تو بے حد لحاظ کرتا ہے۔ اب تو یہ سارا کارخانہ حسام الدین کے دم سے قائم ہے۔ ورنہ نہ لطیف میاں کو آبائی مکان کی فکر ہے نہ شریف میاں کو۔ بیچارے حسام الدین کی کالج میں نئی نئی ملازمت ہے۔ چھوٹی سی تنخواہ پاتا ہے۔ زمانہ ایسا سخت آگیا ہے کہ آدمی پیسے کھاتا ہے پیسے۔ لیکن حسام الدین نے گھر کو دوبارہ سنبھالنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اللہ اسے حیات دے۔ جی ہاں پروفیسر صاحب کا زمانہ اب کہاں؟۔ لیکن بیچارا کچھ نہ کچھ تو دادا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بیچارے نے میرے بیس روپے مقرر کر دیے ہیں۔ کھانا ناشتہ بھی ملتا ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہوں۔ اللہ نے عزت سے گذار دی۔ تھوڑی سی زندگی رہ گئی ہے، دعا کیجئے کہ وہ بھی عزت سے گذر جائے۔

زمانے کو قرار نہیں ہے — ان آنکھوں نے کیسے کیسے انقلابات دیکھے ہیں۔ اور آج بھی لوگ 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے لگاتے ہیں۔ میاں جو دن آرہے ہیں وہ اور بھی سخت ہوں گے۔ قیامت کے آثار ہیں۔

آپ شاید اکتا گئے۔ بس اب حسام الدین آہی چلے۔ میاں آپ حسام الدین کے دوست ہیں،

پڑھے لکھے ہیں، عالی خاندان ہیں ——— جی ہاں بچپن سے جانتا ہوں آپ کو۔ اللہ نے بڑے مرتبے پر پہنچایا ہے، وہ اور ترقی دے گا۔ بس اپنا ہی سمجھ کر آپ کو یہ ذکر سنا رہا تھا۔ کہ ہم لوگ بھی فسانہ ہیں۔

آپ لوگوں کی ذات بڑی غنیمت ہے۔ پرانے لوگوں کو جانتے ہیں، پرانے رسم و رواج سے واقف ہیں، ورنہ میں آپ کو بتاؤں یہ جو تازہ بہ تازہ نسل آرہی ہے، بڑی ہی باغی اور سرکش ہے۔ اسے تو جیسے بھلی بات کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔

اچھا میاں اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔ بڑی سخت ضرورت آپڑی ہے، آپ کچھ مدد کریں تو عین نوازش ہوگی۔ شہر میں سینکڑوں رئیس پڑے ہیں، مگر میں آج تک کسی کے در پر نہیں گیا۔ آپ پر تو حق ہے، اپنے بچے جو ٹھہرے۔

خوش رہیے میاں، یہ آپ نے دو روپے نہیں دیئے ہیں دو ہزار روپے دیئے ہیں، خدا آپ کی عمر دراز کرے۔

۱۹۶۳ء

—— ⁘ ——

ظلمت کدے میں

دیواروں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو شہر کے بیچ میں دیو ہیکل کی طرح کھڑا روشنی اور آبادی سے ہمارے رشتے منقطع کرتا تھا۔ یہ دیواریں اتنی اونچی اتنی سپاٹ اور اتنی مستحکم تھیں کہ آرزوئیں، حسرتیں اور تمنائیں اپنے سر پھوڑ کر مرہم کی تلاش میں ہمارے پاس لوٹ آتیں۔ یہ دیواریں کہیں کہیں ابھر کر ایک نیم دائرے کی شکل بناتی تھیں، جنھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ چاروں سمت دیواروں پر عفریت بیٹھے ہیں۔ یہ عفریت شب و روز ہماری نگرانی کرتے۔ اس سڑک کا انت دیواریں تھیں، ہمارے اختیارات کی آخری سرحد یہ دیواریں تھیں۔ ہماری نگاہیں، ہمارے خیالات۔ لیکن نگاہوں کی کوئی حد نہیں مقرر کی جاسکتی۔ خیالات ان دیواروں کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ وہ ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ یہ دیواریں ان کا تعاقب کرتیں دور دور تک، لیکن پھر تھک ہار کر اپنی جگہ پر لوٹ آتیں۔ ان دیواروں کے اندر حیات کی رفتار کچھ سست سست، ٹھہری ٹھہری محسوس ہوتی تھی۔

یہاں صبح بھی ہوتی تھی، دوپہر بھی ہوتی تھی، شام بھی ہوتی اور پھر رات بھی ہوتی تھی اور یہ معمولات اس طرح جاری تھے جیسے کسی نے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ جب ہوتے آئے ہیں تو ہوتے رہیں گے۔ انھیں اپنی جگہ پر

رہنے دینے ہی میں عافیت ہے ورنہ جانے پھر کیا مصیبت کھڑی ہو۔ صبح اس لئے نہیں آتی تھی کہ ہم نہا دھو کر دفتر کی تیاریوں میں لگ جائیں۔ دوپہر اس لئے نہیں آتی تھی کہ ہم دفتری کاموں میں گھرے دل میں ایک پیالی چائے کی آرزو کی پرورش کرتے ہیں اور شام اس لئے نہیں آتی تھی کہ ہم کاموں سے فرصت پا کر دفتر کے بابوؤں کے ساتھ سائیکلوں کی قطار بنائے اس منزل کی طرف بڑی سرعت سے بڑھتے جائیں جہاں کوئی دیر سے ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔

بجری کی سرخ سڑک پر چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کتاب کے اوراق آپ سے کھلتے جا رہے تھے۔ کھلتے تھے اور پھر بند ہوتے تھے۔

سڑک کی دونوں جانب کتنی ہی بارکیں تھیں۔ اس نے ایک عمر گذار دی۔ یہ کوئی دو ڈھائی سال سے ہے۔ اسے تو آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ سخت پریشان ہے یہاں کے لیل و نہار سے۔ عقل ہوتی تو حالات سے سمجھوتے کی بات کرتا۔

دوسری طرف اُجالے کہیں پیٹ پیٹ کر برستے، کہیں چھینٹے سے پڑ جاتے اور کہیں ننھی ننھی بوندیاں آتے ہی غایب ہو جاتیں، لیکن حیرت یہ تھی کہ دیواروں کے اس شہر میں بھی اُجالے نے ہر گام پر بے انصافی اور بد دیانتی کو اپنا رکھا تھا۔ تو کیا اُجالے ہر جگہ ایک ہی طرح پیش آتے ہیں؟۔ دیواروں پر بیٹھے عفریت نے گردن ہلا کر 'ہاں' 'ہاں' کر دی ——

احاطے میں برگد کے نیچے کرسیاں بچھی تھیں ——۔ دیواروں کے اندر دیواریں بات بڑی ہی ناقابل فہم سی تھی۔ بہت سی باتیں، بہت سا تبسم، بہت سے قہقہے ——

آپ کیسے؟

یہاں اسباب و علل پر کون سوچے؟

ہمیشہ یہی ہوتا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا۔ اسی طرح دیواروں کے سائے میں نشستیں جمائی گئی ہیں، خوب تیز تیز باتیں ہوا کی ہیں۔ فیصلے ہوئے ہیں۔ پھر نئے عزائم دیواروں کی دوسری طرف گملوں کے تختے، رنگین قمقمے اور در و بام پر نئے روغن چڑھانے نکلے ہیں اور جب روغنوں پر خاک اُڑنے لگی، قمقموں کی روشنی مدھم پڑ گئی اور در و بام کے روغن سیاہی مائل ہو گئے تو پھر اسی طرح نشستیں سجائی گئیں اور

پھر اسی طرح تیز تیز باتیں۔ ایک ہی محور پر، ہاں چال کبھی آہستہ ہوتی اور کبھی تیز اور کبھی کبھی تو یوں گمان ہوتا کہ رک سی گئی ہے ـــــ کتنی آہستہ اور کتنی تیز۔

ایک ہجوم عاشقاں تھا طریں وضریف سے کھڑے ہیں۔

ہمیں تو ایک ہی کمبل ملا ہے جناب....

سر پر زخم ہے تمہارے۔ بیچارے سوچتے تھے نہ سر رہے گا نہ سودا۔

مجھ جیسے اور بھی....

یہاں باہر دھوپ کی طنابیں کھنچی ہیں لیکن ان چیزوں سے بے نیاز خدا کی مخلوق کئی صفوں میں بٹی المونیم کی تھالیوں میں رزق حاصل کر رہی ہے۔

کس چیز کی سبزی ہے؟۔

اللہ جانے ہمیں کھانے سے مطلب ـــ

روٹی کچی تو نہیں ہے۔

شکر ہے کہ آپ میں ہنوز یہ احساس باقی ہے۔

ہمیں بھی سامنے والا قطعہ ملنا چاہیے۔ ہم بھی سیاسی........

کسی نے سرگوشی کے انداز میں کہا 'سی کلاس ہے' ـــ

میں نے چپل کے پٹے کو رسی سے باندھتے ہوئے سوچا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے۔ جو جوتے اور چپلیں گانٹھتا ہے وہ ان دیواروں سے پرے اپنے کام میں مست ہوگا۔ دیواروں کے اندر جوتوں اور چپلوں پر کیا گذرتی ہے ـــــــــــ

آپ احساس جمال کی باتیں کر رہے ہیں؟۔

بول تو یوں رہے ہیں جیسے سیکڑوں بازار کھلے ہیں۔

آپ کے یہاں بجلی کی روشنی بھی ہے اور پنکھا بھی ہے۔ اور ڈبل روٹی اور مکھن کا پیکیٹ بھی رکھا ہے، حیرت ہے کہ ہسپتال میں صحت مند لوگ بھی رہتے ہیں۔ اے سورج، ان کو بھی ذرا..........

دیواروں کے عقب میں تم وہ مرغی کا بچہ دیکھتے ہو۔ کیا بیگانگی ہے۔ اس کے سامنے دیواریں ہی

دیواریں ہیں۔ برگد کا پیڑ ہے، باورچی خانے کا اٹھتا ہوا دھواں ہے اور نیچے ایک پر رونق بازار ہے جو سڑک کی ایک جانب لمبا ہوا ہے۔ زندگی کا شور ہنگامہ۔ بھاگ دوڑ۔ بچہ جیسے پوچھتا ہو۔ میں کیا صرف مرفی ریڈیو ہوں؟ ــ کون بتائے آخر۔ اتنے سارے لوگ تو بیٹھے ہیں۔

اور پھر ان بچوں کا جم غفیر۔ انہیں دیواروں کے شہر میں کیوں لایا گیا؟ ــ یہ بچے جو مضافاتی دیہاتوں کے ہیں، جن کے ہاتھوں میں کتابیں ہیں اور تن پر موٹے جھوٹے کپڑے ہیں۔ اور ان کے گھر والے پران کی ماں بہنیں ہر ٹرین کی سیٹی پر چونک سی جاتی ہیں۔ اور یہ انتشار بڑھتا ہی جاتا ہے۔ خاکی وردی والا کہتا ہے یہ شہر کا حسن اور روشنی لوٹنے آئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے جنکے ہاتھوں میں صرف کتابیں ہیں۔ ایک بچہ سب سے الگ تھلگ، جل تھل آنکھوں میں بہت سے عکس لئے کھچڑی کو اپنے آنسوؤں کے نمک میں ملا کر کھا رہا ہے۔

دیر سے غائب تھے، میں چپل کے انتظار میں بیٹھا ہوں ــ

تمہاری چپل؟ ــ

وہ یہاں جیسے آنے کی رواداری نہیں تھی۔ میں یہاں زبردستی لے آیا تھا۔ اب تو رسیاں بھی نہیں ملتی ہیں۔

یہ دال تو بس لیموں ہی کے زور پر چل سکتی ہے۔ سردار بہادر بھی میں ایسی چیز نہیں کھا سکتا ہوں جو سمجھ ہی میں نہ آئے ــ تمہاری تھال کس نمبر کی ہے؟

ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں، ایک انسان ہوں، میرا کنفیشن ہی بہت کافی تھا۔ آخر مجھے ان دیواروں کے شہر میں کیوں لائے۔

ہاں ہم صدیوں سے اس مسئلہ پر سوچتے رہے ہیں اور شاید صدیوں تک سوچتے رہیں گے۔ لیکن فی الحال تو میں صرف ٹوٹی چپل کے مسئلہ سے الجھ رہا ہوں۔ کون سلجھائے اسے۔ خاکی وردی والے نے وعدہ کیا تھا لیکن چپل یونہی پڑی رہی اور اب وہ کہتا ہے مجھے اس کی فرصت کہاں؟ ــ

سامراج کی لائی ہوئی مفلسی، ناداری، بیماری ..... دائیں بازو کی رجعت پسند طاقتوں کی یورش ــ تفرقہ پسندوں کی غداری ــ

اجارہ دارانہ معیشت ــــ پڑوسیوں سے دوستی ــ ویت نام ــ تحریف پسندوں کی عوام دشمنی۔
غلے کی کمی، عوامی حکومت، قومی زبان کی اہمیت ۔
گاندھی وادسوشلزم ــ خالص ہندوستانی سیاسی عقائد۔
میں نے خیالوں کی اس رزمگاہ سے اٹھتے ہوئے سوچا ــ ان میں سے کل کوئی فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا شہر کی رونق میں گم ہو جائے گا اور پھر ان دیواروں کے پیچھے کوئی نئی شمعیں جلائے گا اور خیالوں کی از سرِ نو بزم آرائی کرے گا۔
یہ چھوٹا آفیسر ہے اسی واسطے اس کے پاؤں میں موزے نہیں ہیں ۔ وہ چپل کا مسئلہ ــ ضرور بن جائے گی۔
یہ دو آنکھیں تو دیواروں کو پھاند کر دور دور تک جانے سے قاصر ہیں لیکن تیسری آنکھ کمالِ سبک روی سے کافی لمبا سفر طے کرآئی ۔ ٹوٹے شیشوں کا ڈھیر ۔ جلی لسوں کا ملبہ ۔ بچے کچائے سامان ۔ کچھ ہوا تھا کچھ ضرور ہوا تھا لیکن میں کہاں تھا ــ میں کہاں تھا ــ اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے ۔
اخباروں کا انبار لگا تھا۔ ڈھیر سارے اخبار ہیں لیکن ان میں وہ خاص خبر کہاں ہے ــــ
اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ ــ وہ خاص خبر کہاں ملے گی ۔
اخبار کے دفتر میں رہ کر مجھ سے خبر پوچھتے ہو ۔
یہاں تو دور دور کی خبریں آتی ہیں مقامی خبریں کہاں؟
مقامی خبریں؟ ـــــ
جیسے میری جیب خالی ہے تمہاری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ ہے ۔
کہاں ملے گی وہ خاص خبر؟ ــ منتظر ایک چشمِ نم ہے وہاں ۔
بڑا آفیسر خاکی وردی والے سے چپل منگوا لیتا ہے ۔ چلو یہ مسئلہ بالآخر حل ہو ہی گیا ۔
لسانی تہذیبی اور مذہبی اقلیتیں ۔ ایک ملک ایک تہذیب ۔ ایک ملک مختلف النوع تہذیبیں ــ یہ تکرار ــ یہ تکرار کیا ازل سے ہوتی آئی ہے ۔

یہاں ہولی ہاک بھی ہے، لیلی بھی ہے، گل داؤدی بھی ہے۔ چمپا بھی ہے، گلاب بھی ہے، موتیا بھی ہے ۔۔۔ دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی ۔۔۔ دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھلی۔

آخر کیوں؟ ۔۔۔ کیوں یہ اصرار ہے؟ ۔۔۔

کوئی سڑکوں پر شاختہ فاختہ کر رہا تھا ۔۔۔ آن کی آن میں جیسے فضا میں آہنی عقاب منڈلانے لگے، زمین لاوے اگلنے لگی اور سمندر کی موجیں سر پٹخنے لگیں ۔۔۔ قیامت ایسی قیامت۔

نسلی برتری ۔۔۔ قتل و غارت گری ۔۔۔ گیس چیمبرز ۔۔۔

پھر ایک عظیم فتح ایک عظیم شکست ۔۔۔ خاردار تاروں کی باڑھ اور دیواروں کا لامتناہی سلسلہ ۔۔۔ ایک عظیم فتح ایک عظیم شکست ۔۔۔ آخر فتح کب ہوگی۔ کب ہوگی فتح۔ تاریخ نے دم بھر کے لیے رک کر دریافت کیا ۔۔۔ کچھ پوچھنا ہے میرے بچو! اور پھر بڑی سرعت سے دیواروں کی دوسری سمت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اخبار کے کاغذ میں لپٹی کوئی شے پڑی تھی۔ میں نے کھول کر دیکھا وہ میری ٹوٹی چپل تھی۔

زبان ہمارا ایک مخصوص تہذیبی مزاج تیار کرتی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتے ۔۔۔ یہ میرا مشن۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

عبدل تم؟ ۔۔۔ تمہارا بھی کوئی مشن ہے؟ ۔۔۔

اس نے جھینپتے ہوئے کہا ۔۔۔ بھیا آپ کے آنے کی خبر ۔۔۔ میں کھیتوں پر کام کرنے بھی جاتا ہوں وہاں سے چپل بنوا لاؤں گا۔

رہنے بھی دو، مجھے پھر ایک رسی مل گئی ہے، جسے میں نے چپل کے گلے میں باندھ دیا ہے۔

میں نے نل پہ نہاتے ہوئے دیکھا کہ ایک دسی کلاس عمر نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی چابکدستی سے صابن کی ٹکیہ غایب کر دی۔

بیچارا ..... تم گاندھی وادی سوشلزم اور سو فیصدی ہندوستانی سیاسی عقائد پر گھنٹوں بحث کرتے ہو لیکن اے کھدر کے لبادے میں سمٹی سمٹائی روح! اس معمولی صابن کی چوری کے متعلق تمہارا علم

کیا کہتا ہے؟

حضرت نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر تشریف لے آئے۔ کہنے لگے جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے ــ اور میں نے کہا..... مورخ یوں رقم طراز ہے کہ ایک ننھا مرد دانا جو گل بوٹے اگانے ...... تو پھر شوق سے ان ویرانوں میں گل بوٹے اگائیے ــ موا قع ہی موا قع ہیا۔

میں نے اپنی چپل کی طرف دیکھا جس کی رسی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رسی کستے ہوئے میں نے وہ چپل دیکھی جو ہر لحاظ سے درست تھی اور جس کے پٹے خوب مضبوط تھے۔

رات ابھی کافی باقی ہے برگد کا پیڑ سر جھکائے سو رہا ہے۔ دور سڑک کی روشنی بڑی بھلی لگتی ہے۔ میں سلاخوں سے لگی ہوئی کرسی پر بیٹھا جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹ رہا ہوں ــ یہ مختلف سیاسی عقاید کے لوگ فرش پر کمبل بچھائے جانے کونسا خواب دیکھ رہے ہیں۔ کمرے میں مدھم سی لالٹین روشن ہے اور میں اکیلا کرسی پر بیٹھا خود کو تنہائی کی لذتوں سے روشناس کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ــ ایک خاکی وردی والا گشت کرتا ہوا پہنچتا ہے اور بوٹ جیسی بھاری سیاہ رات میں اپنی لمبی ٹارچ روشن کرتا ہے۔

نیند نہیں آرہی ہے؟ ــ سب ٹھیک ٹھاک ــ

ہاں وہ پروانہ آرہا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ــــ ارے صاحب آپ کے دم سے رونق ہے ــ غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے ــ

اور پھر دیواروں نے اپنا سینہ کھول دیا ــ

جوتے دیکھتے ہی میں نے بڑی تیزی سے ان میں پاؤں ڈال دیئے۔ چپلوں پر ایک آخری نگاہ دوڑائی اور پھر سبھوں کی نظر بچاتے ہوئے انہیں پیچھے کی طرف پھینک دیا۔

مجھے معلوم نہیں کہ ان کا کیا حشر ہوا ـــ شاید دیواروں نے انہیں اپنے گلے سے لگا لیا ہو ـــ

سنہ ۱۹۶۷ء

—·:·—

ڈوبتی اُبھرتی شام

ہم اندر تھے اور باہر شب کی سیاہ کھڑی تھی - ہم چاہتے تھے کہ اسے ہاتھ سے جانے نہ دیں
کہ اگر وہ نکل بھاگا تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا - کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ ساری سفاکیوں کے باوجود بس
وہی تو ایک اپنا تھا - تب ہم نے چلا کر اعلان کیا کہ یارو اسے ہرگز ہرگز جانے نہ دو - کوئی عمدہ سی ٹرائیو
دکھا کر اسے یہیں روک رکھو -

— یہ تیسرا ہفتہ ہے اور ہماری جیبیں کٹ چکی ہیں —

— وقت جیب کترا وقت —

— تو پھر بلیک کوئن —

— ہم گدھے نہیں ہیں —

تو پھر کیا ہیں ؟ —

سوالیہ نشان کہہ لو —

باتوں کا رُخ نہ بدلو —

چانس کے متعلق کیا خیال ہے ــــ

آج کی شام ہم دل پر پتھر رکھنے کو تیار نہیں ہیں ــــ

ہاں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے ــــ

تب ہم کیا کریں؟ ــــ

میر کی کوئی غزل ــــ

جگر کی کوئی غزل ــــ

فیض کی کوئی غزل ــــ

اس میں جھگڑے کا امکان ہے ــــ

تو آخر ہم کیا کریں؟ ــــ

بیت بازی ــــ

مجھے اشعار یاد نہیں رہتے ــــ

مجھے اپنے اشعار پڑھنے کی اجازت دی جائے ــــ

تم سرقے کی غزلیں ــــ

تم خود ــــ

لڑائی بند کرو ــــ تم لوگ سنجیدگی سے کسی مسئلے پر غور نہیں کرتے ہو ــــ

"سنجیدگی" بولتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ تمہاری ناک ٹپک جائے گی ــــ

ہم فضول بحثوں میں وقت برباد کر رہے ہیں ــــ

بجا ارشاد ہوا ــــ

تمہیں کچھ سوچو کہ تم تو بڑے دقیق سمجھے جاتے ہو ــــ

یعنی یہ کہ ہم لوگ آوازوں کے اس بکس کو کھولیں اور ان کے قدموں کی چاپ سنیں جو پہلی بار سوت کاتنے والی بڑھیا کے گھر اتریں گے ــــ

سراسر بکواس ــــ

یہ چار دن ہم پر بڑے سخت گذرے ہیں۔

نہیں، نہیں وہ پیشگوئی ——

شاید کہ یہ آخری رات ——

شاید کہ یہ آخری رات ——

محفل کو خاموشی کیوں سونگھ گئی ——

ہم آہ کو واہ میں بدل سکتے ہیں ——

یہ کوئی نئی سائنسی ایجاد؟ ——

نہیں نہیں —— رقص مئے تیز کرو ——

ہاں ہاں —— رقص مئے تیز کرو ——

تسخیر ماہتاب ——

یہ ماہتاب بار بار ماہیٔ بے تاب کیوں بن جاتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ آج تک سامنے کھڑکی والے چاند کو سر نہیں کر سکے۔

تم نے وہ فلم دیکھی ہے ——

تم تو خاصا اچھا گا لیتے ہو ——

یہ کیا لوفریت پھیلا رکھی ہے ——

وہ چاند اب نہیں نکلے گا کہ کچن سو چکا ہے۔

پھر ہم کیا کریں ——

ہم رنگ و نور کے سیلاب میں کھو جائیں۔

یہ فیصلہ صحیح ہے ——

تم نے اس کیلنڈر کو کئی قدم آگے بڑھا دیا ہے ——

اسے اس خانے میں کیوں فٹ کیا گیا ——

شروعِ سردیوں کے دن ـــــ شروعِ بہار کے دن ـــ

یہ کیسی نگوں سے لدی پھندی دکھائی دیتی ہے ـ

بس ایک حسن ـــ

اور جو چیز ہے وہ فانی ہے ـ

یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کاغذ کے محبس سے نکل بھاگے گی ـ

تم نے ٹھیک ہی کہا ، بہاروں کو یوں قید بھی نہیں کر سکتے ہیں ـ

تم لوگ بڑے بیکار لوگ ہو ـ اس وقت ہر کمرہ روشنی کے سیلاب میں ڈوبا ہمہ تن گوش ہے '

اور تم بیکار باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو ـ

چھوڑو اس چکر کو ـــــ

ہم باتیں ہی کریں ـــــ

ہاں ہم باتیں ہی کریں گے ـــ

اس بچی سے جب کہا جاتا ہے 'بے بی بات کرو' تو کہتی ہے 'بات' ـ

میرے دل پر کتنا بھاری پتھر دھرا ہے ـــ وہ میرا دست گرانڈیل ـ

کیا اُتار رہے ہو ـــ

کل رات گئے تک وہ سُرخ سُرخ سی حیات کو چھلکا رہا تھا اور آج صبحدم وہ کافور ہو گیا ـــ

یہ پتھر کیسے سرکے گا ـــ

وقت اس پتھر کو سرکا دے گا ـــ

وقت جو بڑا بدخواہ ہے ، وقت جو بڑا خیر خواہ ہے ـــ

آج شام میں نے چائے پی تھی ! ـــ

زیادہ نہیں صرف چار کپ ـ ـ

اسے حسن طلب کہتے ہیں ـ ـ

شاید ہم سبھوں کو چائے کی ضرورت ہے ـــ

مل جائے تو ٹھیک ہے نہ ملے تو بھی ٹھیک ہے ۔

ہم سب جہاں رہتے ہیں وہاں ہر شے صحیح ہے اور ہر شے غلط ہے ۔

میرے ایک نہیں کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے ۔

تمہاری میز پر رکھی اسٹینڈ پر جھکا ہوا لکڑی کا بیرا مجھے پسند آرہا ہے ۔

ساری زندگی قلابازیاں کھاتا رہے گا ۔

یہ ہمارا minature ہے ۔

اتنے زور سے نہ ہنسو کہ وہ سامنے والی لکڑی جاگ اٹھے ۔۔

میں تو یہی چاہتا ہوں ۔۔۔

نہیں اُسے سونے دو ۔۔۔

نہیں اسے جاگنے دو ۔۔۔

تم میری باتوں پر عمل کروگے تو فائدے میں رہوگے ورنہ ۔۔

ورنہ کیا ؟ ۔۔۔

ورنہ ہم خسارے میں رہیں گے ، چلو کوئی تو رہبر ملا ۔۔۔

ہم بھی یہ سوچ رہے تھے کہ اس کڑے وقت میں ۔۔

اب ہم آنکھیں موند کر آگے بڑھیں گے اک مسیحا نفس ۔۔۔

مذاق چھوڑو اور اب اسے حرکت میں لاؤ کہ جسے ہم نے اسیر کر رکھا تھا وہ بھاگ نکلا ہے ۔

تم ایسا نہیں کر سکتے ۔۔

بھاگتے سایوں کے پیچھے ۔۔

سایہ کیا دے گا سایہ ۔۔

تم بڑی ذہانت کی باتیں کر رہے ہو ۔

اعجاز ہے اس شام کا ۔

واقعی یہ سلسلہ کچھ دلچسپ ہے ۔

چینختی روشنیاں مجھے نہیں گوارا ہیں۔

تو پھر ----

خاموش خاموش سی، دھیمی دھیمی سی ---

تم ہمیشہ تخیل کے اپالو پر سوار رہو گے ---

ہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے آگے کے اس پھیلے ہوئے مسائل کے درمیان سے تم آخر کس طرح نکل بھاگے ---

سوچو تو ہم سبھی اپنے اپنے اپالو پر سوار بیٹھے ہیں۔

تم نے دلوں کے چور کو سامنے لا کھڑا کیا۔

ہم سب تمہارے اس غم میں شریک ہیں ---

رقص سے تیز کرو ---

تم نے دلوں کے چور کو ہمارے سامنے پیش کر کے ایک قومی خدمت انجام دی ہے۔

یہ سیاسی اصطلاحیں ---

سیاسی اور سراتی ہم وزن ہیں ---

تم قافیہ اور وزن ---

پر وہ تو بے وزن ہو چکے ہیں۔

تمہیں آج یہاں قرار نہیں ہے ---

اگلے سفر پر ہم تمہیں بھی ساتھ کر دیں گے ---

اگلا سفر --- اور اگلا سفر --- اور اگلا سفر ---

مریخ --- زہرہ --- مشتری --- زحل --- عطارد ---

اور جب یہ ہمارے سلسلے ختم ہو جائیں گے تو پھر ہم کیا کریں گے۔

سوچنے کی بات ہے۔

ہم دیوار کی طرف منھ کر کے کھڑے ہو جائیں۔ یہ سوچنے کا بہتر طریقہ ہے ---

کریں گے اہل نظر۔۔۔

تازہ بستیاں آباد۔۔۔

شاعری نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔۔۔

ہاں تو پھر؟۔۔۔

یہاں اتنے سارے دا۔۔۔نش۔۔۔ور۔۔۔یکجا ہیں اور کوئی اس دپھر' کو سر نہیں کر سکا۔

میری سنو۔۔۔

ارشاد۔۔۔

حاضرین با تمکین ایک چھوٹی سی ساعت کے لئے اپنے دم سادھ لیں۔۔۔

پھر ہم اس نظام شمسی سے نکل کر دوسرے نظام شمسی میں داخل ہو جائیں گے۔

واہ۔۔۔واہ۔۔۔واہ

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اپالو سخت سست رفتار تھے۔

تو یوں ہوا کہ اس کے دوست نے اسے سمجھایا کہ اس سنکھ کو کیا لئے پھرتے ہو یہ تو تمہیں دن بھر میں صرف دو روپلیاں دیتا ہے۔ یہ مجھے دیدو اور تم یہ پدم سنکھ لے لو۔ یہ تمہیں دو کے چار اور چار کے آٹھ دے گا۔

تب وہ پھول کر غبارہ ہو گیا اور اس نے پدم سنکھ سے کہا۔

'پدم سنکھ دو روپئے دیدو'

دو کیا لو گے چار لو۔۔۔

چار ہی دیدو۔۔۔

چار کیا لو گے آٹھ لو۔۔۔

آٹھ ہی دیدو۔۔۔

آٹھ کیا لو گے سولہ لو۔۔۔

سولہ کیا لو گے بتیس لو۔۔۔

بتیس کیا لوگے چونسٹھ لو ــــ
چونسٹھ کیا لوگے ......
سارا دن اور ساری رات ــ تب وہ اسے اپنے سینے پر رکھ کر سونے کے شہر میں گم
ہو گیا ــــ
تم سب کہاں ہو؟ ــــ
تم سو رہے ہو؟ ــــ
تم جاگ رہے ہو؟ ــــ
دیکھو وہ اب اترنے والے ہی ہونگے ــ
نہیں نہیں اس جہاں کے در نہ کھولو ــــ
کھولو ــــ کھولو ــــ
مت کھولو ــــ مت کھولو ــــ

سنہ ۱۹۶۱ء

ــــــ ∴ ــــــ
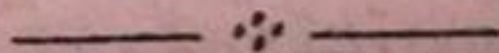
نقشِ ناتمام

وہ دانت نکوسے تپتی ہوئی سیخ کو انگاروں کی سیج پر گھما رہا ہے۔ اس کے چہرے پر بلا کی سفاکی برس رہی ہے۔ آنکھیں اُبلی پڑ رہی ہیں۔ اگر یہ دیدے باہر نکل آئے تو وہاں دو کالے کالے بڑے بھیانک غار رہ جائیں گے اور بس۔ اس کے تاج پر بے شمار خنجر لگے ہیں جن کی انیاں جیسے کلیجے میں چبھ رہی ہیں۔ اُکڑوں بیٹھے ہوئے، اس کے گھٹنے سر کے برابر پہنچ گئے ہیں اور وہ تیزی سے سرخ سیخ کو انگاروں کے بستر پر دہکا رہا ہے۔

کیسے تیز تیز ناخن ہیں اس کے، بس ایک کھرونچے میں کام تمام۔

اس دیوزاد سے کیسا خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔

اس بند کمرے میں پھر بھی عافیت ہے۔ ہرچند کہ یہاں بھی اوپر کا پنکھا منھ سے گرم گرم بھاپ پھینک رہا ہے، لیکن اس پھنکاریں مارتے ہوئے عفریت کا تو خیال آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل تیزی سے نشیب کی جانب ڈھلک گیا ہے۔

اس تانبے جیسے دہکتے ہوئے سناٹے میں باہر کون جائے۔ اس اندھیرے کمرے میں جہاں پنکھا ننگے جسم پر گرم گرم سی ریت پھینک رہا ہے پھر بھی آسودگی ہے۔

اس خوفناک سے سناٹے میں لپکتی ہوئی ہواؤں کے پیکر کس طرح سارے میں خرمستیاں کرتے پھر رہے ہیں۔

اس کمرے سے باہر۔ نہیں — نہیں — نہیں —

دور سڑک کے کنارے رکشوں کی قطار سجی ہے — نہیں اس عفریت سے ڈر نہیں لگتا؟ پر یہ لوگ تو لپکتی ہوئی ریت پر بے تکلف چلتے ہیں، جب پیاس لگتی ہے تو معدے سے پانی کی تھیلی نکال کر پانی پی لیتے ہیں اور جب پہاڑ جیسے طوفان آتے ہیں تو ریت میں اپنے نتھنے ڈال کر دم سادھ لیتے ہیں اور جب وہ گذر جاتے ہیں تو نئے سرے سے اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں۔

چھوکرے اور چھوکری کو دو دو پاپا (بسکٹ) منگلے کو ایک پاپا — ایک پیالہ گرم چائے۔

چھوکری نے دونوں پاپے چشم زدن میں صاف کر دیے۔

حرامزادی ڈکار بھی نہ لے گی —

قاسم اور چھوکرے نے بیک زبان کہا۔

اور پھر چھوکری نے وہی ہر روز کا رٹا رٹایا سبق شروع کر دیا۔

'ایک پاپا اور — لا دو بابا'

یہ صدائیں اگر در بدر گشت کریں تو شاید .... لیکن بادا، وہ تو سمجھتا تھا کہ ریکارڈ پر ایک خراب سوئی چڑھ گئی ہے — پھر اہمیت کس بات کی۔

چائے خانے کے بھول وجود رحمان نے چپکے سے چھوکرے کو ایک پاپا اور دے دیا۔ یہ چوکڑیاں بھرتا ہوا چھوکرا، ایک پاپے کے عوض اوڑوس پڑوس میں کم از کم پندرہ بیس پیالیاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ چھوکری بہت دیر تک بسورتی رہی، لیکن تیسرا پاپا اُسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ جو چوکڑیاں بھرتا ہے وہی کھاتا ہے۔ پھر اس چھوکری کا کام بھی کیا ہے، دن بھر منگلے کو گود میں لئے کسی کو آم کھاتے دیکھ رہی ہے، کسی کو حلوائی کے یہاں جلیبیاں اور پوریاں کھاتے دیکھ رہی ہے۔ اس سے اس کے اندر پاپا کے علاوہ کئی اچھے کھانے کی اشتہا بھی موجود تھی، لیکن پاپا ایک قریبی منزل کی حیثیت رکھتا تھا — جلیبیاں اور پوریاں تو دور بہت دور خوابوں کے جزیرے آباد کر رہی تھیں۔

منگلا آشوب چشم کے سبب شب و روز سر جھکائے ریں ریں کرتا رہتا، اس کی ناک کا سوتا کبھی خشک نہیں ہوتا۔ چھوکری جب اُسے کمر پہ چڑھائے چڑھائے تھک جاتی تو دو چار دھول دھپے مار کر اُسے کسی دوکان کے

اوٹے پر بیٹھا دیتی۔ ننکے کا پیٹ غیر معمولی طور پر بڑھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح خشک اور پتلے تھے۔

"پیر بہوڑ چلو گے؟"

قاسم نے آسمان کی اور دیکھا' وہاں ہر چہار سمت بڑے بڑے چمکتے شیشے گرم شعاعوں کے تیر چلا رہے تھے اور پیر سم شعار سجنوں کے کاروبار میں مگن تھا۔ اسے ایک لمحے کے لئے جھرجھری سی آگئی۔

"ڈھائی روپے۔"

سُرمئی سڑک دیونداد کی لہکتی ہوئی سیج کی طرح حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تھی۔ سیدھی اور سپاٹ۔ لوگ سڑکوں پر کنارے کنارے یوں چل رہے تھے کہ جیسے کہیں وہ دیکھ نہ لے۔

قاسم نے انگوچھے کو بھگو کر سر پہ رکھ لیا۔ نل کا نل ایک پتلی سی دھار کے بعد سوں سوں کرتا ہوا بہت سی داستانیں سنا کر خاموش ہو گیا' کہ قاسم ہی تو اس کا مزاج شناس تھا۔

"ارے نفیر وا' ارے شمسنیا ہم ابھی آوے ہیں رے۔"

"جا ہو ببا۔ ہمرے لئے آم لیتے آئیو۔"

"کھانے میں تو استاد ہے۔"

چھوکرے نے کہا۔ "ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔"

چھوکری نے کہا۔ "ہم بھی۔ ہم بھی۔ ہم بھی۔"

ننکے نے تو اس ہیمِ اسرارِ کائنات کو ابھی آنکھ کھول کر دیکھا ہی نہیں تھا۔

نفیر وا نے شمسنیا کو ایک دھول جمائی۔ "جا ہواں اوٹے پہ بیٹھ۔"

شمسنیا نے جواب میں اسے بھی ایک دھول جمانی چاہی لیکن نفیر وا تو ہواؤں کے دوش پر سوار رہتا تھا وہ کچھ دور اس کے پیچھے بھاگی' لیکن ننکے کو لے کر کب تک۔ اس نے ننکے کی پیٹھ پر دو مکے دھم دھم لگائے۔ ننکا قیں سے چیخا اور اس کے بند منھ سے تھوک کی ایک پھوار اڑ گئی۔ "کم بخت مرے تو چین ملے اور مُشکرا نفیر وا بھی مرے گا۔" وہ اپنی پیٹھ سہلاتی ہوئی دیر تک کوستی رہی۔

ننکا روتے روتے پیشاب کرنے لگا۔ دوکان والے نے دیکھا تو اپنے نوکر پر گرج اٹھا۔ "کتنی بار کہا کہ اس حرامزادی کو نہ بیٹھایا کر۔" نوکر نے شمسنیا کو ایک زوردار چپت لگائی۔ "دھو پیشاب اس کا پلید

کہیں کی۔" اس کی آنکھیں چھلک گئیں اور اس نے نوکر پر سرخ انگارے پھینکے لیکن وہ آنکھوں کی جھیل ہیں تیر کر رہ گئے۔

ہلکی سیجوں کے سائے میں رہنا اور آنکھوں کی آگ کو جھیل کے پانی میں ڈبو دینا!۔

اس دن چار آم کے بٹوارے میں نفیروا سے اسکی پھر چل گئی۔

کل چھ آم آئے تھے۔ قاسم نے اس دن چار یا پانچ روپے کمائے تھے۔ زندگی جو آخر داؤ پر لگائی تھی۔ ان کے درمیان سوکھے پتے میں لپٹی ہوئی سات آٹھ چپاتیاں تھیں ۔۔ تھوڑے سے کباب اور پیاز کا سلاد۔ اور وہ اکڑوں بیٹھے دوکان کے ادٹے پر . . . .

ایسے اچھے دن تو بس کبھی کبھار بھولے بھٹکے آجایا کرتے تھے۔ نفیروا سوچتا اگر آسمان میں روز ہی اس طرح آگ لگی رہا کرے تو کیا برا ہے۔ اس نے ثمینا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کئے جن کا مطلب شاید یہ تھا کہ "کھائے کم بکھت جی بھر کے ۔۔ بابا چھا پا کھانے والی" پر ننکا تو ایک آدھی روٹی لئے ناک اور رال کے ساتھ ٹونگتا رہا۔

وہ تو ماں کی آہوں کی در و دیوار سے وہ کوٹھریا کھڑی تھی ۔ پر جب وہ اپنی آہوں سمیت پڑوس کے قبرستان میں جا بسی تو معاً اس کوٹھریا نے اپنے سر کی چھت آتار پھینکی اور در و دیوار تیزی سے ننگے سر اور ننگے پاؤں جانے کہاں بھاگ کھڑے ہوئے۔

پانی، روشنی اور مٹی ۔۔ جب کچھ نہیں تو فقط مٹی، سچ پوچھو تو یہ مٹی بڑی دمساز ہوتی ہے۔

ننکے کے پاس ایک قمیص تھی۔ ثمینا کے پاس ایک فراک اور ایک جانگیہ، نفیروا کے پاس ایک بنیائن اور ایک نیکر اور قاسم ایک بنیائن اور ایک لنگی چڑھائے رہتا تھا۔ یہ چیزیں ماں کے زمانے سے چلی آرہی تھیں۔ ان کے علاوہ اور ضرورت بھی کیا تھی، کہ آسمانی قبائے تو سب کچھ ڈھانک ہی لیا تھا۔

ننکے کی قمیص تاریخ کے اوائل دور میں جانے کس رنگ کی تھی۔ پر اب تو بہت سارے رنگ، بہت سارے داغ دھبے، بہت ساری کنا فتیں اور بہت ساری بدبوؤں نے اپنے اپنے نیزے اس قمیص پر چبھو دیئے تھے ۔۔ مونڈھے سے پھٹی قمیص جس کے ایک بھی بٹن سالم نہیں تھے ۔۔

جسم پر جو بھی بلائیں آتیں وہ کپڑوں سے ہو کر اندر جاتیں۔ کپڑے بڑی خندہ پیشانی سے اپنے سینے

بڑھا دیتے اور پھر کسی نہ کسی طرح دل لخت لخت کو یکجا کر لیتے۔

یہ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی کثافتیں! ——

اسٹینڈ پر رحمان چلائے والا اسے سمجھاتا کہ کپڑے دھولو! اتنے گندے کپڑوں میں نیند کیسے آتی ہے اور پھر بہت کچھ ——

"ہم لوجھ ہیں نا رے، پر ہم دوسرے تیسرے کھود رات کو یہاں سے جا کر کپڑا دھو دے ہیں۔"

یوں جب لوگوں کی زبانیں تھک کر دم لینے لگتیں تو پھر کسی دن دو آنے کا سوڈا لا کر وہ ثمینہ کے کے حوالے کر دیتا اور جب کبھی ٹرک کا نل تھک تھکا کر سستانے لگتا تو ثمینہ بنگلے کی قمیص، اپنی فراک اور نصیر دا کی بنیائن اور نیکر، نل کے نیچے ڈال کر سوڈے کی پوری پڑیا ان پر ڈال دیتی۔ نصیر دا تو قاسم کا انگوچھا لپیٹ کر نیکر اُسے دھونے کو دے دیتا، پر ثمینہ کے پاس کوئی ایسا کپڑا نہیں تھا جسے پہن کر وہ اپنی جانگیہ اتار سکے اور تب یہ کام دو تین قسطوں میں انجام پاتا۔ کپڑوں کے اوپر سوڈا چڑھا کر وہ نل کو زور سے دبا دیتی۔ چپ چاپ کھڑا ہوا نل زور سے دھار دیتا۔ "کیا ہے رے کمبخت" اور تب ہی ثمینہ دیکھتی کہ کپڑوں پر سوڈے کی بس ایک ہلکی سی پرت رہ گئی ہے، اوپر کے حصے کو پہلی ہی تیز دھار بہا لے گئی ——

مگر ثمینہ قاسم کو یہ بات کبھی نہیں بتاتی۔ اگر سوڈا نہ بھی بہتا تو کیا فرق پڑتا۔ یہ میل اس موسم کی ہے، یہ اس موسم کی ہے اور یہ دور کسی اور موسم کی ہے اور اوپر جاتا ہوا ہر زینہ کپڑوں پر میل کی ایک نئی تہہ ثبت کر جاتا۔ اس مضبوط سے زینے کو یہ دو آنے کا سوڈا اور یہ کچے کچے ہاتھ، کیا خاک ڈھاتے۔ اور تب ہی ثمینہ کو پولس چوکی کے سامنے کی دکان کی وہ مشین یاد آجاتی۔ لیکن پھر اچانک جیسے اسے کوئی ٹوک دیتا۔ "ارے ثمینہ وہ مشین تو میل کے ساتھ کپڑے کو بھی چاٹ جاتی رے۔ بلا سے صاف ہوں یا نہ ہوں، کپڑے تو چل رہے ہیں اگر یہ بھی ختم ہو گئے تو؟"

اس "تو" کے آگے ثمینہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نہ اس نے کبھی جنگل دیکھے تھے نہ درختوں کی چھائیں دیکھی تھیں، اور نہ وہ دن دیکھے تھے جب دھندلا دھندلا آسمان سورج کی راہ تکتے تکتے اونگھ سا گیا تھا ——

جب اندھیرے میں چلو تو ہر گذرے ہوئے قدم پر اطمینان کی سانس لینے کو جی چاہتا ہے۔ چلو یہ

قدم تو بخیر و عافیت گزر گیا، اگلے قدم سے بے فکری تو اس وقت ہوتی ہے، جب ہاتھ میں ایک چراغ بھی ہو۔

منکا دن بھر دبی دبی ریں کرتا رہتا۔ مرجھائے سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں کے درمیان اس کا بڑا سا پیٹ —— دن بھر میں دو تین پاپے سے زیادہ اس کے بجز منہ میں نہیں پہنچتے تھے، لیکن قاسم ہر ایک سے کہتا۔ "بس دیکھنے کا ایسا ہے، ہاتھ پاؤں سلائی، پیٹ فضل الٰہی۔"

مگر جب اس دن منکے نے دوکان کے اوٹے پر بیٹھے بیٹھے ریں ریں کے درمیان پانی جیسی بدبودار سی، لس دار اجابت کی تو کلاتھ مرچنٹ کلیم الدین نے قاسم کو اچھی طرح پھٹکارا۔

"مر جائے گا تو بادشاہ، میم اور غلمٹا کرتے رہیو۔"

"ای سالا بحری ہے دوکاندار —— بکری کی طرح منہ چلے ہے اس کا —— دن بھر ریں ریں کرے ہے، بدن میں لگے تو کیسے۔"

مگر کلیم الدین کی بات کو اٹھانے والے کچھ اور بھی مل گئے۔

"ارے معصوم کی آہ نہ لے کم بخت۔"

"چار رنگ کا ڈاکٹر ہے وہ۔" وہ اپنے دیدے گھما گھما کر سبھوں کو سنا رہا تھا——

"دن کو دس گیارہ بجے تک پھوڑا پھنسی، چیر پھاڑ، مرہم پٹی کرتا ہے، پھر ہاتھ دھو کر ہومیوپیتھک کا بکس کھول لیتا ہے، دو تین گھنٹے دوائیں بانٹتا ہے، اس کے بعد دوکان بند کر کے کھانا کھانے گھر چلا جاتا ہے۔ تین بجے سائیکل لے کر انجکشن دینے در بدر مارا پھرتا ہے، اور شام کو چراغ جلنے پر پھر ہومیوپیتھک کا بکس کھول کر دوکان پر بیٹھ جاتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو دوکاندار ہم کو تو اس کی دوا لگے ہے۔" قاسم نے اپنی لنگی گھٹنے سے اٹھا کر فیل پا دکھایا۔ "دیکھو یہ ایک دم سڑ گیا تھا، بھکار رہنے لگا تھا —— سنار نے مرہم دیا اور کھانے کے لئے دوا —— دو چار چوٹ میں فائدہ ہو گیا۔"

کلیم الدین نے عقیدتوں کی منہ زور موجوں سے ٹکر لینا بے سود سمجھا اور اپنے گاہکوں میں الجھ گیا۔

کئی دنوں تک دوا چلتی رہی۔ قاسم نصیرا کو چونی دے کر ستار کے یہاں بھیج دیتا —— نصیرا منکے کو گود میں لے چٹکیاں لیتا ہوا اور گالیاں دیتا ہوا ستار کے یہاں لے جاتا کہ حرکت دعمل کے چوڑھے

گاڑیوں کے ایندھن سے روشن رکھے جاتے تھے ۔۔۔ یوں ایندھن بھی سستا اور آگ بھی سستی ۔

بوتل کا کاگ اُڑائے کافی دیر ہو چکی تھی اور قاسم ٹھنڈے پانی کی لہروں کی طرح بے فکر سا ہوتا جا رہا تھا ۔ "آخر یہ ستار حرام خور کب تک نوچتا رہے گا ۔"

آخر کب تک ۔۔۔ آخر کب تک ۔۔۔

"ننکا نواب اچھا ہے رے ۔۔۔ تب ہی ریں ریں کم کر رہا ہے ۔"

نصیر دا اپنا کاندھا ہلکا ہوتے دیکھ کر بول اٹھا ۔۔۔ "ٹھیک تو ہے بادا اب دوا کا جرورت کا ہے ۔"

اس پلکتے ہوئے زمانے میں دن کی سواری میں اچھے پیسے مل جاتے خصوصاً دور کی سواری میں لیکن ہوتا یہ تھا کہ لانبے راستے تو پیسے کو کھینچ لے آتے ، لیکن پیسے پھر لانبے راستوں پر بھاگ نکلتے ۔۔۔ پتوں کا کھیل جھاگ کی ملکوتی عمارت کھڑی کر دیتا ۔۔۔ خوشنما اور خوش رنگ پر دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین بوس ہونے لگتی اور بالآخر ایک میلی سی بدنما سی پرت ۔۔۔

کبھی تین روپے ، کبھی چار روپے اور کبھی پانچ روپئے ۔۔۔ پر شام ڈھلتے ہی اسے یوں لگتا کہ جیسے کوئی اونچی سی دین کے تخت پر کھڑا ، جسم پر رنگا چنگا چغہ لادے ، منہ میں بھبوت لگائے ، سر پہ مخروطی ٹوپی ڈالے ، دنیا بھر کی بے ہنگم حرکتوں کے درمیان چلّا چلّا کر کہہ رہا ہے ۔۔۔

"کل کی ہار کو جیت بنا دو ۔۔۔ کل کی جیت تو آج اس سے بڑھ کر جیت ۔۔۔ ہار روز روز نہیں ہوتی ۔۔۔ مقدر پردے کے پیچھے سے جھانک رہا ہے ۔۔۔"

اور یہ دین آگے بڑھتی جاتی ، آگے بڑھتی جاتی ۔۔۔ اور پھر نہ وہ دین دکھائی دیتی ، نہ وہ کھڑکھڑاتا ہوا مخروطی ٹوپی والا مسخرہ ۔۔۔ سب کچھ جیسے فضا میں تحلیل ہو جاتا اور وہ جانے کیونکر گوبند پہلوان کے اڈے پر پہنچ جاتا ۔۔۔

راستے میں کسی پاسی خانے میں بیٹھ کر آدھی بنی چڑھا لیتا ۔۔۔ تھکے ہوئے جسم اور دکھتے ہوئے ہاتھ پاؤں میں بوجھل پڑ جاتا تو شین نئے سُروں میں پھر پھڑانے لگتی ۔۔۔ بیساکھ میں کیا ٹھاٹھ رہتے ہیں ، ہر ہر موڑ پر ہر کوچے میں ۔۔۔ "جب مریا تاڑی کے دن میں تارے تلے گزوا یو جی ۔" یہی تو دن ہوتے ہیں ۔۔۔ پوربانی کے جو رنگے کچھ پیام لے کر آتے ، کچھ سرگوشیاں کرتے ، پر قاسم اپنے ہاتھ پھیلا کر کسی اور طرف متوجہ ہو جاتا ۔

رکشا گیرج میں بند کر کے قاسم انگوچھے میں منھ پوچھتا تو نفیروا سمجھ جاتا کہ اب اس کی آنکھ گوبند پہلوان کے اڈے پر ہی کھلے گی اور تب وہ اور شمشیا شور مچانے لگتے ۔۔ "بابا جاؤ ہو تو ہم کو کھانے کو دیتے جاؤ" قاسم نانے کو کہتا ۔ "ابھی آ دیں ہیں رے ابھی آ دیں ہیں" ۔ تبھی اس چیخ پکار میں ننکا بھی ریں ریں شروع کر دیتا اور قاسم اٹھ دس آنے اس تیز دھارے کی نذر کر کے بھاگ کھڑا ہوتا ۔

گوبند کے اڈے پر جوئے کے کھیل میں گڑبڑ کے بہت کچھ امکانات تھے، لیکن ناٹ (کمیشن) کی رقم میں خرد برد کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا ۔ مشہور تھا کہ گوبند کی پکڑ اونٹ کی پکڑ ہوتی ہے ۔۔ رکشے کے روز کی جمع رندو ۔۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مالک کی زبان کے کٹ اور تیز شور مچاتے، گرجتے برستے اٹھیں گے، گھڑی دو گھڑی کے لئے لیکن پھر سرد پڑ جائیں گے ۔۔ "کل ضرور" ۔ پر گوبند تو ہنسلی توڑنے لگتا، پہلوان ہی تھا ۔ ٹھکرٹ اتار دیا تو کیا ہوا، ریاض گیا ہو اجسم تو سلامت ہے ۔

اور رات جب اپنے جوڑے باندھ کر آخری پہر کے خواب میں مست ہو جاتی تو قاسم تھکے تھکے قدم اٹھاتا، بیڑی کے آخری کش کھینچتا، اسٹینڈ پر پہنچ جاتا ۔

"کہاں ہے رے نفیروا ؟"

لیکن اودھوں پر ہر سمت خواب کی زنجیریں بکھری پڑی دکھائی دیتیں، اور تب وہ نیپالی چوکیدار کو بیڑی دے کر پوچھتا ۔ نفیروا کہاں ہے بہادر ؟ ۔۔۔

"ادھر بیڑی والے کے اڈے پر ہوتا ہے" ۔

قاسم اپنی دنیا کو دیکھ لیتا ۔ ایک ساعت کے لئے اسے وہ رقم یاد آ جاتی جو گوبند پہلوان کے اڈے پر ۔۔ دنیا رنگ و روغن سے چلتی ہے اور یہ رنگ و روغن ۔ لیکن کل ضرور ۔ اور یہ کل تازہ گلاب کے ہار لئے مسکراہٹیں بکھیرتا سامنے سے آتا دکھائی دیتا ۔ کل جو ہمیشہ کل رہتا ہے ۔

پھر یکایک بجلی کی طرح اس کے ذہن میں یہ بات آتی کہ اگر اس وقت کوئی ہمدردی کی ساری مل جائے تو کیسا ہو ۔ لیکن پھر جیسے ہاتھ پاؤں سر بھی الگ الگ منہ کے بل گر جاتے اور آنکھوں میں مرچ کے بیج سے بھر جاتے ہاں وہ انہیں ملتا ہوا ۔ ایک نئی بیڑی سلگاتا اور اپنے رکشے کے گدے پر لیٹ جاتا ۔

تب ایک شام ایسا ہوا کہ آسمان پر چنگیزیوں نے حملہ بول دیا ۔ وہ زرد رنگ کی وردیاں پہنے

زرہ بکتر سے لیس ہر سمت پھیل گئے ۔ لانبے لانبے ڈگ بھرتے ہوئے فوجیوں نے چیخ پکار شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے درختوں کے جسم سے خوبصورت پتے نوچ ڈالے، ان کے بازو چھین لئے پھر وہ ہوا کے زینے سے اتر کر گھروں میں، دوکانوں میں، دفتروں میں اور ہر کوچہ و بازار میں گھس پڑے۔ دروازے سر پیٹتے رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ فرش پر ہرے اور پیلے پتے پڑے ۔۔۔ زرد رہے تھے اور ان پر غبار نے موٹی سی چادر ڈال دی تھی ۔۔۔ پھر آسمان پر سفاک تلواریں چمکنے لگیں۔ دل ہلا دینے والے بگل بجے ۔۔۔ فوج آگے بڑھ رہی تھی اور آسمان نے زمین کے تپتے سینے پر پانی کا چھڑکاؤ شروع کر دیا تھا ۔۔۔

گاؤں کے ماسٹر نے دوکان سے سر نکال کر دیکھا اور ان کا چہرہ بہت سے روشن چراغوں کے درمیان دمکنے لگا۔ بڑے بڑے بلبلے زمین پر گرتے ہی بے حقیقت سی ہنگامی بن کر جانے کہاں گم ہو جاتے۔

ماسٹر نے بیٹھے ہوئے کہا ۔۔۔ "بستی بھی لوٹنا ہے"۔

"کون سا نچھتر ہے، ماسٹر جی" ۔۔۔

"روہن ہے بھائی"۔

اور جب گھنٹے پون گھنٹے کے بعد سورج آسمان کے منچ پر نمودار ہوا تو اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ تاج جس کے چاروں طرف برچھیاں ہی برچھیاں لگی تھیں اتر چکا تھا اور اب اس کے ننگے سر پر صرف دو سینگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھا، پھر زمین پر نظر ڈالی ۔۔۔ ایک اطمینان اور خوشی کا احساس سب ہی دلوں کو اُجالا بخش گیا ۔۔۔

بارش کھیتوں اور کھلیانوں سے اناج کے بوروں سے بھری بیل گاڑیاں لاتی ہے۔ منڈی میں مستی ہوتی ہے اور گھروں میں چولھے روشن رہتے ہیں جن سے پیٹ کی آگ ۔ یعنی آسمان سے زمین تک کی راہ میں ایک پہیہ تھا جو سدا سے چکر لگا رہا تھا ۔۔۔

پھر تو جب دیکھو آسمان پہ جنگل کے بدمست ہاتھیوں کا جھنڈ اِس سرے سے اُس سرے تک خرمستیاں کر رہا ہے۔ اچانک ان پہ دیوانگی سی طاری ہو جاتی اور جب یہ پہاڑ جیسے جانور آپس میں ٹکراتے تو آسمان میں آگ سی لگ جاتی اور ایسا بھیانک شور اٹھتا کہ شہر و بیاباں کے سینے دہل جاتے اور تب اس بھیانک دن کے بعد آسمان کی سلسبیل زمین کی پیاس بجھانے کھڑی ہو جاتی۔

لیکن اس جل تھل نے بہت سے راستے بند کردیئے تھے۔ سڑک تو پھر بھی ٹھیک تھی، لیکن گلیوں میں کیچڑ بھر گیا تھا۔ لوگوں نے دور دور پر اینٹیں بچھادی تھیں اور ان پر اللہ آمین کرتے ہوئے چلتے تھے۔ گلیوں اور کوچوں میں بہت سے کچے مکان، بہت سی بوسیدہ عمارتیں مجروح و شکستہ عالم ہو پڑی کراہ رہی تھیں کہ کوئی اٹھاؤ مجھ میں اب سکت نہیں۔

گاؤں میں وہ جو دکانوں اور کاروباروں کو چمکاتے تھے کھیتوں میں لگے تھے ــــ جو بوئے گا وہی کاٹے گا ــــ ان کے آگے ایک روشن بازار کا منظر تھا اور بس ــــ راستے میں گھٹنے گھٹنے بھر پانی تھا اور جو جہاں تھا وہیں پڑے رہنے میں عافیت محسوس کرتا تھا۔ گاؤں کے اونگھتے ہوئے بیکار کاروباری شہر سے رشتہ توڑ بیٹھے تھے، شہر کا کاروبار بھی جیسے ایک ٹانگ پر کبھی کبھی چھوٹی سی چھلانگ لگالیتا تھا۔ بیوپاریوں کا مال، اسٹیشن، ٹرک کے اڈے اور گھاٹ تک سے جانا بند تھا۔ ہر سمت ایک پہیہ چل رہا تھا اور یہ مختلف پہیئے ایک بڑے پہیئے کو حرکت میں رکھتے تھے۔

شام کو صرف بارہ آنے آئے تھے، بس ایک سواری اسٹیشن تک کی ملی تھی۔ اس میں کیا ہوگا؟ تاڑی چلتی ہے تو گوبند کے اڈے پر جانا ممکن نہیں ــــ گوبند کے اڈے پر جانے سے تاڑی گئی۔

"لڑکن سب اور جان مارن ہیں" ــــ فکر کا یہ قافلہ دوسری سمت نکل کھڑا ہوا۔ آج اس بارہ آنے کی نگاہوں کے سامنے بہت سی سوالیہ نشانوں کی صلیبیں کھڑی تھیں۔

اس نے چھ آنے کی چار چپاتیاں لیں ــــ دو دو آنے کی دو چائے بنوائی۔ ایک چائے خود لے کے بیٹھ گیا تو پھر نصیروا کو آواز دی ــــ "لے لے رے" ــــ تین چپاتیاں اور ایک گلاس چائے اس نے اسے تھمادی۔ نصیروا رحمان سے المونیم کا کٹورا مانگ لایا اور جب اس نے روٹی توڑ کر اس میں بھگودی تو وہ اور شمسنیا اس پر ٹوٹ پڑے پر ننکا تو آدھی روٹی کو ہاتھ میں لئے چاٹتا رہا اور ریں ریں کرتا رہا۔

بیچ بیچ میں قاسم چیخ اٹھتا۔

"ارے نصیروا حرامی اس کو مارے کاہے رے"

"دیکھو نے بادا......"

"ارے شمسنیا اس کو کوسے کاہے رے"

"دیکھو سنے بادا...."

دوسرے دن اس کا فیل پا النگارہ بنا ہوا تھا۔ بدن میں سخت درد، تشنج اور منھ میں صابن کی نکیہ سی پڑی تھی۔ رکشے کی گدّی سے اُتر کر وہ دکان کے اوٹے پر بیٹھ رہا۔ لیکن جب گھڑیال نے آٹھ کی صدا دی تو پریشانیوں کے عفریت گاتے بجاتے اس کے سر پر آدھمکے ۔"اب کیا ہوگا؟" دوکاندار تو آتے ہی اوٹے سے اُتار دے گا۔

لیکن پھر جیسے کسی نے سرگوشیوں میں کہا۔"کلیم الدین کو آنے دو۔"

پہلی منزل پر کلیم الدین کا رہائشی مکان تھا۔ سڑک پر آنے والی سیڑھی ایک بند سی ڈیوڑھی میں کھلتی تھی۔ کلیم الدین آیا تو اس نے دیکھا کہ قاسم کو ملیریا نے جکڑ رکھا ہے۔

قاسم نے ہانپتے ہوئے کہا ۔"وہ ڈیوڑھی...."

کلیم الدین بات کاٹتے ہوئے بولا ۔"ارے وہ تو رات کو اندر سے بند ہو جاتی ہے، وہاں تو دم گھُٹ جائے گا۔"

لیکن قاسم کی "ہائے ہائے" میں سب کچھ دب گیا۔

ڈیوڑھی میں پھٹے پرانے ٹاٹ پر پڑا قاسم سوچ رہا تھا کہ نصیر دوا کا تو رحمان انتظام کر ہی دیتا ہے، لیکن شمسنیا اور ننکا جو سر پر سوار رہیں گے ۔"ان کا کیا ہوگا؟"

ننکے کو زمین پر بٹھا کر شمسنیا قاسم کا سر دبانے لگی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پاؤں پھٹ جائے گا۔ کیسی اندرونی مار تھی کہ سارا وجود دانت بھینچ کر کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارے اندر سے نکل جاؤں گا ۔۔ میں تمہارے اندر سے نکل بھاگوں گا۔" بدن کی سل تپ رہی تھی اور ہر آن یہ گمان ہوتا تھا کہ کہیں وہ پھٹ نہ جائے۔

ڈیوڑھی میں سیلن تھی، اُدس تھی، لون لگی ہوئی مٹی کی بو تھی اور سخت گرمی اور گھٹن تھی۔ فرش کچے اور نم تھے لیکن اس کی چشم پرنم کہہ رہی تھی ۔"بلا سے چار دیواریں تو ہیں، چھت تو سالم ہے، دروازے تو دونوں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔" پھر جیسے کوئی دانائے راز اس کے اندر سے نکل کر بولا ۔"آسمان تلے مرنے سے، اس چھت کے نیچے مرنا بہر حال اچھا ہے۔"

اس نے کراہتے ہوئے شمسنیا سے کہا — "ارے نصیروا کو تو بلا رے —" اور جب نصیروا سر کھجلاتا آ پہنچا تو اس نے اس کے سامنے ایک پہاڑ جیسا سوال کھڑا کر دیا —

"شمسنیا اور ننکے کا کا ہو گا رے —"

ویسے حالات کی سنگینی کا علم تو نصیروا کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور تھا لیکن یہ "پہاڑ جانے کب سے کھڑے ہیں اور جانے کب تک کھڑے رہیں گے —" اور بہت سے گڈمڈ خیالات اس کے ذہن کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہے، انہیں باہر نکالنے کی راہ کبھی نہیں ملی —

وہ چند ساعت کے لئے خلاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر اپنے باپ کی نظروں سے نظریں ملائے، چپ کی داستانیں سناتا رہا۔ "کیا ہو گا" نصیروا کی ٹھہری ہوئی آنکھیں یہی کہہ رہی تھیں —

"بھیا کو بلاویں کا" وہ یک بیک بول پڑا —

اسی گھڑی کلیم الدین وہاں آ پہنچا — "بھیا کون ہے نصیروا —"

"برابر کا لڑکا ہے دوکاندار —"

"تم نے آج تک نہیں بتایا —"

"معلوم تھوڑے ہی ہوئے ہے کہ بیٹا ہے —"

دوپہر میں کلیم الدین کے یہاں سے کھانا آ گیا۔ کچھ روٹیاں، کچھ چاول، کنارے پر کوئی سبزی۔ گھر کے کھانے کی بوباس وہ کب کے بھول چکے تھے، یوں اس بوباس نے جو اجنبی بن چکی تھی، ان پر عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی —

بشیروا نے دروازے پر آ کر ہانک لگائی — "کا ہے —"

قاسم نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا — "کھ نا رے کچھ نا — تیرے پر کوئی حق ہے —"

اور تب بشیروا خالص دانش ورانہ انداز میں جھپٹ گیا —

"جب تیرا اچھا وکت تھا تو ہم سے الگ رہیو اور اب جب وقت پڑا ہے تو ہمری جرورت ہو رہی ہے —"

ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی طول طویل سی کہانی کا اقتباس سنا گیا، جس کی ابتدا اور انتہا کہیں گم سی تھی —

سننے والے صرف دیدے پٹپٹاتے رہے لیکن کلیم الدین بپھر گیا۔

"یہ کیا رے بدتمیز — باپ سے اسی طرح بات کی جاتی ہے۔ وہ بھی اس حالت میں کہ وہ مرا جا رہا ہے"

"ارے آپ کیا جانیے دوکاندار — اسی کے غم میں مر گئی، نیک بخت میری ماں۔"

سننے والوں نے کڑی سے کڑی جوڑ لی۔

"تاڑی پینے میں سینئر — جوا کھیلنے میں سینئر — اس پر ایسی ایسی مار مارے تھا اُسے — ای تو کئے کا پھل بھوگ رہا ہے۔"

"دوکاندار — یہی میرے برخوردار ہیں — جرا اس سے پوچھئے ای ماں کو کیسے نکالا کر دیا تھا — دس بارہ کے سن سے تو سالا بیڑی، سگریٹ، تاڑی، جوا، چوری سب شروع ہو گیا تھا — مرتے مر گئی لیکن ای الٹ کے نہ پوچھس کہ کچھ دوا دارو بھی ہوگا — پوچھنے نے کون کہس تھا اس کا دوا دارو؟"

پھر ننکے نے ریں ریں شروع کر دی۔ شمسینا نے، جو کھمبے میں کھڑے ان دونوں باپ بیٹے کا بیان سن رہی تھی، اسے دو ہتڑ رسید کیا اور ریں ریں تیز ہو گئی۔

بھیڑ جو دو حصوں میں بٹ گئی تھی، کئی حصوں میں بٹ کر منتشر ہو گئی اور اب سناٹا تھا — ننکے کے لئے رحمان کی توتلی سے ایک بابا آ گیا تھا جسے لے کر وہ اپنی ذات میں گم ہو گیا تھا۔

قاسم ہائے ہائے کرتا رہا — پاؤں میں چھوٹے بڑے کتنے ہی چھالے ہو گئے تھے جو سویرے سے رِس رہے تھے۔ کلیم الدین نے اسے اپنی پھٹی لنگی لا کر دی تھی جسے اس نے اپنے زخم پر باندھ لیا تھا۔

کلیم الدین کے گھر سے ایک بڑھیا دن ڈھلے کے قریب کھڑاؤں کھٹکھٹاتے پہنچی۔ ایک ہاتھ میں چاول اور روٹیوں کی رکابی، ایک میں دال کا پیالہ — کسی نے بھاری پتھر سرکایا اور پھر ایک ڈول میں روٹی سالن اور چاول ڈال کر کنوئیں میں لٹکا دیا۔

دوسرے دن کلیم الدین کے حکیم دوست اُسے آکر دیکھ گئے۔ "بہت پرانا عارضہ ہے پھر بھی....."

انہوں نے کچھ کاڑھا دانڈھا لکھ دیا اور دانوں پر لگانے کے لئے ایک مرہم دیدیا۔

ادھر ننکا کئی دنوں سے سخت بیمار تھا۔ اسے دست آ رہے تھے۔ ہر دست کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ننکے کی ریں ریں ایک زینہ اور اتر گئی۔ شمسینہ دکان کے یہاں سے لوٹا لا کر دھلا دیتی، بیچ بیچ میں گالیاں

اور کو سے بھی دیتی جاتی ۔۔۔ یوں ڈیوڑھی میں پیشاب اور پاخانے کی سخت کھرانداور تیزابی سی بُو پھیل گئی تھی۔

قاسم نے نصیرا سے کہا ۔۔۔ "ستارے دوالے آرے، کہیے کہ پیسہ جب ہوگا تو چکتی کردیں گے۔"

ستار نے دوا بھیج دی تھی ۔ وہ کبھی کبھی سبز ڈبے کی چونی کسی اور جانب بھی ڈھلکا دیتا تھا ۔

لیکن دوسرے دن سویرے ننکا ایک آخری بین کے بعد، جو اس نے کسی اندھیرے تہہ خانے سے سخت کوششوں کے بعد برآمد کی تھی اس دروازے سے نکل کر، اس بازار سے نکل کر انجانی راہوں پر بھاگ کھڑا ہوا ۔۔۔ وہ جو چلنا بھی نہیں جانتا تھا ۔

بشیرا بھی آگیا تھا ۔ آہ وبکا ۔۔۔ بین ۔۔۔ ہچکیاں ۔۔۔ وہ بچہ دیر تک آنکھوں کے چشمے میں نہاتا رہا ۔۔۔ کچے فرش پر بیٹے لیٹے وہ جانے کدھر کو چلا گیا تھا ۔ عجیب سا سفر تھا ۔

اڈے پر ہولار کشے والا لیڈر سمجھا جاتا تھا ۔۔۔ اس نے ننکے کو اٹھانے کے لیے پیسے اکٹھے کرنا شروع کر دیے ۔ پہلی چونی بشیرا کی تھی ۔۔۔ ڈیڑھ روپے جمع ہو گئے تو کلیم الدین کو معلوم ہوا اس نے ان سے پیسے لے کر قاسم کو دے دیئے ۔ "یہ تم اپنے لیے رکھ لو۔"

پھر اس نے کفن دفن کا انتظام خود کر دیا ۔

رکشے والوں نے مل جل کر ڈیوڑھی دھو ڈالی اور یہ سب کرنے کے بعد اگربتی اور لوبان جلا کر ایک المناک فضا کی بنیاد ڈال دی ۔۔۔ ننکے کی موت نے کئی اور عنایتوں کے دروازے کھول دیے تھے ۔ کسی نے شمسنیا کو نہلا دھلا کر اپنی بچی کی تنگ فراک اور جانگیہ پہنا دی ۔ ادھر رحمان نے بھی نصیرا کو پاپلین کی قمیص سلوا دی تھی ۔

لیکن قاسم کا پاؤں تو کچھ اور زیادہ پک گیا تھا ۔ اب تو اس میں بدبو بھی آگئی تھی ۔۔۔ وہ دن بھر پڑا ہائے ہائے کرتا ۔ بس دن میں دو ایک بار لاٹھی ٹیکتا ہوا پبلک لیٹرن کی طرف نکل جاتا ۔

دیوار پر ایک گڑ سا بنا ہوا تھا ۔۔۔ رات کو اس پر چراغ جلا دیا جاتا تھا ۔ اس کی لو سے دیوار کالی ہو گئی تھی ۔۔۔

اور کالک کی اس موٹی تہہ پر نصیرا نے کچھ نقش و نگار بنائے تھے ۔۔۔ ایک آدمی کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے، ایک میں سگریٹ ہے ۔ آنکھوں پر عینک چڑھی ہے، سر پر ہیٹ ۔۔۔

("پاسنگ شو ہے یا لیٹن؟")

ایک خوبصورت سا گھر ــ منقش در و دیوار منقش چھتیں ـــ احاطے میں ایک پائیں باغ ـــ
باغ میں ہر چہار سمت سبزہ و گل کے لہراتے دامن ــ گردن جھکائے قلقل کرتا ہوا فوارہ ــ پھر گھر میں ایک
لعلِ شب چراغ اور روشنی کا غسل ــ
کنارے وہ تنکا جس کے ایک سرے پر کالک لگی ہے ٹوٹا پڑا ہے ـــ

۱۹۶۹ء

ـــــــ ⁂ ـــــــ

دریا ایک رات کا

اور جب اس نے سارا اثاثہ اکٹھا کر لیا تو اس کی آنکھوں نے خوب چراغاں منایا، بڑے ہی طربناک گیت گائے اور بہت سی کہانیوں کو کُو بہ کُو بکھیر دیا۔ اور جس دم اس کی آنکھوں کا شہر جاگ رہا تھا، اس کا چہرہ اندھیرے میں گُم تھا، ماتھے کی شاہراہیں تاریک تھیں اور لب سلے تھے، زندگی بس ایک شہر میں تھی۔

وہ بستی کی جانب نکل گیا، جہاں دُور دُور تک کچے اور کمزور مکانوں کا سلسلہ پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ یہ مکان ایسے تھے جو طوفان اور برق و باراں کے ایک معمولی سے اشارے سے اپنی بنیادیں چھوڑ کر سارے میں اپنی داستانیں سناتے پھرتے۔

اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک شخص مکان سے برآمد ہوا، جس کے چہرے کے سارے نقش مٹ چکے تھے۔ اس نے دائیں ہاتھ کو ایک معمولی سی حرکت دی۔ اتنی رات گئے ؟ کیوں ؟ — اور کیسے ؟

بند لبوں کے یہ سوال بے حد واضح اور مکمل تھے۔

تب اس نے ایک طویل سانس کے زورِ شور پر سفر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت سارا اثاثہ اور مالِ تجارت لے کر دریا کی دوسری جانب والی منڈی میں جا رہا ہے۔ تم بھی اپنا سامان ....

اس کی گفتگو کے قدم ابھی تھمے بھی نہیں تھے کہ اس نے گھر کے سامان کو سمیٹنا شروع کیا۔ اس بوڑھے آدمی کے جسم میں جانے کہاں سے ایک برقی رو سی دوڑ گئی تھی۔

اسی طرح وہ ایک ایک دروازے پر گیا اور سبھی جگہ سے سامان حاصل کرنے کے بعد رات گئے اپنے دروازے پر پہنچا۔

آسمان کی بزم چمک چمک کر اونگھ سی گئی تھی اور دریا ایک ہیبت سے خواب میں گم تھا۔

تب اس نے سارا اثاثہ خچروں کی پیٹھ پر لادا۔ یہ خچر گردن جھکائے بے حد اطاعت گزار دکھائی دیتے تھے۔ اس نے بتایا کہ جھکڑے کہیں بھی نہیں ملے۔ انتہائی تلاش و جستجو کے باوجود۔

پھر یہ خچر کہاں سے آئے؟ ——— اس سوال پر وہ دیر تک کسی دور افتادہ منظر کو دیکھتا رہا۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کوئی بڑی سی بادبانی یا دخانی کشتی آئے گی۔ اسی پر مالِ تجارت لادا جائے گا اور تب کہیں گھنٹوں کی محنت کے بعد کشتی کا لنگر اٹھے گا کہ اتنے ہی میں وہ ایک خچر کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

اب حالات ان کی فہم سے بالاتر ہوتے جا رہے تھے اور پیچیدگیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

تب ہی اس نے ایک بے حد بلند قامت سی آواز میں خدا حافظ کہا اور خچروں کی صف کو ہانکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

آگے دریا اپنے پہلو میں ایک مہیب سی خاموشی لیے دراز تھا حدِ نظر تک ———

انہوں نے آسمان تک اپنے نعرے بلند کیے ——— رک جاؤ کہ یہ کھلی ہوئی خودکشی ہے۔ سامنے موت کا فراخ سینہ ہے۔ بس اگلا ہی قدم ایک بھرپور زندگی کو 'کچھ نہیں' میں بدل دے گا۔ رک جاؤ کہ تم اکیلے نہیں ہو، ہمارا بھی سب کچھ تمہارے ساتھ ہے۔

اس پر اس نے نفرت و حقارت میں ڈوبا ہوا ایک دیو ہیکل قہقہہ بلند کیا جو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پھیلتا گیا اور اوپر اٹھتا اور ان نہتوں پر کاری وار کرتا گیا ——— دیر تک وہ ان پر وار کرتا رہا۔ اور جب انہیں اس سے نجات ملی تو انہوں نے دریا کی جانب دیکھا۔ لیکن دریا کا عفریت تو سب کچھ نگلنے کے بعد خاموشی کی

ایک معصوم سی ردا اوڑھ کر سو چکا تھا۔

وہ دیر تک دریا کے ساحل پر رنج و ندامت کے سیلاب میں ہچکولے کھاتے رہے۔ وہ غرقاب ہو چکا تھا اور موج تہ آب اس قافلے کی اکائی کو کتنی ہی اکائیوں میں تقسیم کر چکی تھی ——— قافلے پر کیا بیتی؟ ان کا کیا حشر ہوا؟ ایک بے حد سرد سی لہر اُن کے اعصاب کو معطل کر جاتی۔ سارا اثاثہ۔ سب کچھ۔

وہ آپس میں ایک دوسرے کو تکتے رہے، جیسے وہ اپنے درمیان کسی خطاکار کو ڈھونڈھ رہے ہوں لیکن تلاش و جستجو کی راہوں سے ہوتے ہوئے ان کی نظریں انہیں ان کے اپنے وجود کے سرے پر پہنچا دیتیں

"خطاکار میں ہوں" ———

ان کے چہرے ملبے ہوتے گئے اور وہ اس چوٹ کو مقدر کے حوالے کر کے اپنے فانی وجود کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چلے۔ بھاری قدموں کی راہ میں انہوں نے سوچا۔ وہاں فقط ایک اللہ کا نام ہوگا۔ اور وہ بھی ہوگا یا نہیں کیا کہا جا سکتا ہے۔

وہ پہلی رات تھی جب انہوں نے امیدوں سے اپنے رشتے توڑ لئے تھے ——— لیکن دوسری رات کسی کٹی پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ دریا کنارے پہنچ گئے ——— شاید وہ آ گیا ہو۔ اور اس وقت ان کی گرہ میں ہوش و حواس کی جگہ صرف ایک 'شاید' تھا۔

اور یہی شاید انہیں مہینوں اور برسوں دریا تک لے گیا، جہاں امیدیں آنکھیں پھاڑے آسمان کی اور دیکھ رہی تھیں اور جہاں نا امیدیاں سیاہ چادر لپیٹے گہری نیند میں گم تھیں۔

وہ آنکھوں میں انجانے شہر کی کہانیاں لے کر آئے گا۔ اس کے ساتھ سینکڑوں خچر ہوں گے جن کی پیٹھ پر بیش بہا خزانے لدے ہوں گے۔ وہ منافع کی رقم کی تقسیم کرے گا۔ اسی جگہ دریا کنارے اور ہمارے دن پھر سے لوٹ آئیں گے۔

پھر راتیں تحلیل ہوتی گئیں۔ سینکڑوں اور ہزاروں۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ اور تب انہوں نے جوڑ جوڑ کر صعوبتوں کے درمیان سے گزر کر گھر کی اُجڑی تصویر کو نئے رنگ و روغن سے آراستہ کرنے کی سعی شروع کر دی۔

سُنانے والا اس کہانی کی، جو سینہ بہ سینہ سفر کرتی تھی، یوں ابتدا کرتا کہ یہ آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔

تب ایک کثیف سی رات کی چادر سے وہ برآمد ہوا اور اس نے میرے دروازے پر دستک دی۔

اتنی رات گئے کسی کا دستک دینا، یوں بھی مجھے دہشت میں گرفتار کرنے کے لئے بہت تھا۔ بھیانک طوفان میں ایک کانپتا ہوا درخت۔ میری زبان پر اچانک زنگ سے لگ گئے اور وہ کسی ناکارہ قفل کی طرح بند پڑی رہی۔

اس کی آنکھوں کا شہر اس دن بھی جگمگا رہا تھا۔ بس آنکھوں کا شہر۔

اپنا ساز و سامان میرے حوالے کر دو کہ میں باہر کی منڈی میں......،

ابھی جملہ ادھورا ہی تھا کہ میں نے گھر کا مال و اسباب سمیٹنا شروع کر دیا۔ پلنگ، تخت، میز، کرسیاں، کتابیں، شیلف، ظروف...،

اور سب کچھ اکٹھا کر چکا تو اس کی آنکھیں دیوار کی جانب بلندیوں پر اٹھ گئیں۔

میں نے نرم لہجے میں کہا ــ میں اسے نہیں اُتار سکتا، ہیں نہیں......وہ ایک خوبصورت تصویر تھی۔

پل بھر کے لئے اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں، بس پل بھر کے لئے اور پھر اُن میں آپ ہی آپ روشنی لوٹ آئی۔

اچھا، اس نے لمحے بھر کے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

وہ خچروں کی فوج کو لے کر دریا میں داخل ہو گیا۔ میں کنارے کھڑا چیختا رہا اور دیر تک اس کے قہقہوں کا دیوزاد میرا پیچھا کرتا رہا۔

سب کچھ تو وہی تھا۔ کل جو دور تھا، کل جو قریب تھا اور آج جو نگاہوں کے دائرے میں ہے۔

میں تھکے تھکے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ بس ایک تنہا تصویر۔

لیکن دوسرے دن جانے کون سی طاقت تھی جو مجھے کشاں کشاں دریا تک لے گئی۔

امیدوں کا دھاگہ ہاتھ سے نکل نکل جاتا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ میرے ہاتھ آ گیا ہے، لیکن

وہ میرے ہاتھ نہ آتا۔

مہینوں اور برسوں گزر گئے۔

اور ابھی اس لمحے ــــــــــــــــ وہ تصویر اسی فتحمندی کے انداز میں اگلے پچھلے وقت کی موجوں کو اپنے اندر سموئے ایک بھرپور اعتماد کے ساتھ دیوار سے پیٹھ لگائے جمی ہے۔ باہر شاید دریا خاموش ہے۔ شاید وہ بھرا ہوا ہے۔ اور رات کا پیالہ جو بھرتا جاتا ہے، جو خالی ہوتا جاتا ہے۔

۱۹۷۰ء

ــــــــ •:• ــــــــ

کاغذِ آتش زدہ

تصادم کے نتیجے میں دو درخت میں آگ لگی۔ دونوں اپنے اپنے سر دھنتے رہے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرے درخت نے چیخ کر کہا —— 'یہ کیا'۔ وہ جیسے جیب و گریباں کو جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن آگ تو ہواؤں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ وہ وحشت میں کبھی سر کو جھٹکتے، کبھی دست و بازو کو سمیٹتے، پر ہوا یہ کہ ....

یہ صبح جس کی ابتدا خون سے ہوئی تھی، میرے لئے بڑے بڑے کاغذوں کے طشت میں بس خون ہی خون سجا کر لائی تھی۔

دریاؤں کی دوسری جانب زبانوں نے دکھ درد کی ردا اوڑھ کر صدائیں بلند کیں، کچھ عزائم آنکھوں میں ہلکورے کھاتے ہوئے فضا میں لہرائے۔ تب ہی کچھ خنجر چمکے، کچھ سنگینیں اٹھیں۔

اور خون جو برسا، خون جو دریا ہو گیا۔

آگ اور خون کے اس کھیل میں شکلیں پہچانی نہیں جاتیں۔ ہر آنکھ ایک سلگتی ہوئی چتا ہے، ہر دل چٹانوں کے نیچے دبا کراہ رہا ہے۔ ہر ہاتھ کا خنجر زخمی روح لئے تڑپ تڑپ اٹھتا ہے۔ کون کسے

مار رہا ہے؟ ۔ ہر مقتول قاتل ہے، ہر قاتل مقتول ۔

میرے ہاتھ خون میں لت پت ہو گئے ہیں ۔ میں انہیں غور سے دیکھ رہا ہوں ۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ یہ میرے قلب و جگر تو نہیں ۔ یہ طشت میرے پیاروں کا سر تو نہیں لایا ہے ۔ لیکن لاتعداد خون کے دریا، لاتعداد آسودہ حال سر اس طرح اپنی آبادیوں میں گم ہیں کہ کسی کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔

یہ صبح جو خون پیتی، ہڈیاں چباتی آئی ہے ۔

لیکن وہ صبح جو ایک بچے کی مسکراہٹ سے طلوع ہوئی تھی ۔

ایک مکان کی اوٹ سے دھوئیں کے پیکر گردن جھکا جھکا کر باہر نکل رہے تھے ۔ پاس ہی ایک تاڑ سینہ تانے، ٹھیک نالے کے کنارے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور نالے کی دوسری سمت پکے چبوترے پر ایک ٹیوب ول لگا تھا جس کے ہتھے کو اوپر سے نیچے لانے میں سخت محنت پڑتی اور جو ہمہ وقت چرچوں کی رٹ لگاتا رہتا ۔ اس حد تک تو یہ منظر بے حد گونگا نظر آیا ۔ لیکن ٹیوب ول کے ہتھے کو سنبھالے ایک ننھی سی جان اسے بولنا سکھا رہی تھی ۔ ننھا اپنے سے اک ذرا بڑے لڑکے کے ساتھ تھا ۔ وہ لڑکا کچھ دیر پہلے اسے نل پر بٹھا کر نہلا چکا تھا ۔ اب وہ اپنی نیکر اتار کر نل کے نیچے بیٹھ گیا تھا اور ننھے سے کہہ رہا تھا کہ وہ نل چلائے ۔ ننھا جس کے بال بھیگ کر سر پر چپک گئے تھے اور موتی جیسی بوندیں سارے جسم سے ٹپک رہی تھیں، بڑی پھرتی سے ہتھے کے قریب آیا ۔ چرچر کی منزل اس نے آسانی سے طے کر لی لیکن چوں آتے ہی وہ ہتھے کے ساتھ جھول گیا ۔ بڑے نے کہا "ٹھیک سے چلا ۔" ننھے نے پھر کوشش کی ۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ چرچر کو تو وہ فوراً ہی سر کر لیتا لیکن "چوں" آدھے ہی راستے پر اس سے آزاد ہو جاتا ۔ اسی کوشش میں وہ ایک بار لڑکھڑا کر گر بھی پڑا لیکن بے وزنی اس کے کام آ گئی اور وہ پھر سنبھل کر کھڑا ہو گیا ۔ بڑے لڑکے نے ایک بار پھر کہا ۔۔۔ "ابے کیا دیکھ رہا ہے کام کر ۔۔۔" لیکن ننھا آگے پیچھے کچھ دیکھ رہا تھا ۔ "اس چوں پر کیسے فتح پائی جائے ۔"

وہ ایک بار پھر ہتھے پر جھول گیا ۔۔۔ یکایک ایک نیزہ لہرایا جس کے آخری سرے پر ننھا ۔۔۔ لہو میں ڈوبا ہوا ۔۔۔ ایسا کاری وار تھا کہ میں تڑپ اٹھا ۔ تب ہی میں نے ننھے کو ہتھے سے اتارا اور چرچوں میں مصروف ہو گیا ۔ ننھا اپنی چال سے کئی کئی زاویے بناتا ہوا کنارے ۔۔۔ جا کھڑا ہوا ۔

بڑا لڑکا نہا چکا تو میں ننھے کے قریب چلا گیا ۔ اس کی حیران حیران سی نگاہیں شاید میرا تعارف

چاہتی تھیں۔ لیکن میں تو اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے ایک زمانے سے دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ وہ ہر بن مو سے ٹپک رہا تھا اور پھر ٹپکتے ہوئے پانی کے ان قطروں کو جو اس کے سر کی راہوں سے ہوتے ہوئے اس کے ہونٹ تک پہنچتے اپنی چھوٹی سی زباں سے جذب کر لیتا تھا۔ اس عرصے میں وہ سر اٹھا کر مجھے کئی بار دیکھ چکا تھا اور اس طرح ہم اجنبیت کے بند مکانوں سے نکل کر کھلے میدانوں میں آ گئے تھے کہ بار بار ایک دوسرے کو دیکھنے کا عمل ایک طرز بیاں بن گیا تھا۔

اتنے ہی میں ننھے کو کچھ یاد آ گیا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے اچکتا ہوا ٹیڑھے میڑھے خطوط بناتا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بھی اپنی جگہ پر واپس آ کر مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اب صرف ٹیوب ول کا ہتھا میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

کچھ دیر بعد ننھا چھوٹی سی بالٹی لئے اپنے گھر سے نمودار ہوا۔ وہ بالٹی اٹھائے بے توازن سا ہو رہا تھا۔ میرے سامنے آ کر وہ ایک لمحے کو ٹھہر گیا۔

میں نے دھیرے سے کہا 'ننھے اِدھر آؤ'۔ میری آواز سن کر اس نے اپنی آنکھوں میں بہت سی شرارتیں بھر لیں اور پھر اپنی چھوٹی سی زبان نکال کر چپکے سے میرا منہ چڑا یا اور نل کی طرف بھاگ نکلا۔

کیسا اُبلتا ہوا تازہ خون ہے۔ میں واش بیسن کی طرف بڑھتا ہوں۔ لیکن اپنے ہاتھ دیکھ کر پھر رُک جاتا ہوں 'کہیں یہ میرا خون تو نہیں'۔۔ کون بتائے؟ ۔۔ وہ پرندہ بھی تو جانے کن فضاؤں میں جا بسا۔

میں بہت دور جا کر واپس لوٹا تو اپنے دوست کے اسٹور میں گھڑی بھر کے لئے بیٹھ رہا۔ گاہک آتے تھے اور قیمت چکا کر اپنے سامان لے جاتے تھے ۔۔ اتنے ہی میں ایک بچہ اسٹور میں داخل ہوا۔ اس نے مدھم سی آواز میں دریافت کیا۔ 'چھوٹی پریکٹیکل بُک ہو گی'۔

'بارہ آنے کی ہو گی'۔ بچے نے کہا 'ساٹھ پیسے میں دیدیجئے نا'۔" میرے دوست نے ملائم لہجے میں جواب دیا 'نہیں اتنے میں نہیں ہو گی'۔ اور یہ کہہ کر وہ ایک گاہک سے باتیں کرنے لگا۔ بچے کے سر پر کیس کا جوڑا خوبصورت سی ربن سے بندھا تھا اور اس نے پٹریوں والی اسپورٹس شرٹ اور ہاف پینٹ پہن رکھی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اس سے باتیں کی جائیں، تب ہی میں نے اس کے گردن میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔
"بیٹے آپ کے پاپا جی کا کیا نام ہے۔"
بچے نے بتایا۔ "سرینندر سنگھ"۔
پھر اس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بہت سے چھوٹے چھوٹے سکے برآمد کئے۔ ان سکوں میں کوکا کولا کی بوتل کا کارک بھی تھا۔ میں نے اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹے یہ آپ کی چیز ہے۔"
بچے کی مسکراتی آنکھوں نے گویا شکریہ ادا کیا۔۔۔
'یہ ساٹھ پیسے ہیں، پندرہ پیسے اور لاتا ہوں۔'
وہ چھوٹے سکے اسی طرح کاونٹر پر پڑے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بچہ پھر ہانپتا کانپتا پہنچا۔ اس کی مٹھی میں پندرہ پیسے دبے تھے۔ یہ پیسے بھی اس نے کاونٹر پر ڈال دیئے۔
سیلز مین نے چھوٹی پریکٹیکل بک اس کے حوالے کی۔ اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوکڑیاں بھرتا بھاگ نکلا۔۔ اس کے جانے کے بعد میرے دوست نے سکے گنے تو دس پیسے فاضل تھے۔ میرے دوست نے انہیں تیزی سے دوبارہ گنا اور اپنی سیٹ سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "یار اسے پکارو وہ دس پیسے فاضل دے گیا ہے۔"
میں نے اسٹور سے نیچے اتر کر نظر دوڑائی، لیکن وہ بچہ تو چھلاوہ تھا۔
'تمہیں اس کا پتہ معلوم ہے۔'
'اتنا ہی کہ اس کے پاپا جی کا نام سرینندر سنگھ ہے۔'
میں اس طشت کو دور پھینک دیتا ہوں جس میں قاتل مقتول کے سر سجا لائے ہیں اور مقتول قاتل کے اور چاروں اور خون کا ٹھاٹھیں مارتا دریا ہے، جس میں شاید کہ میرا اپنا خون بھی شامل ہے، لیکن اسے پہچانے کون؟۔۔
اور اس بھیڑ بھاڑ اور ہنگامے سے پرے ٹیوب ول کے ہتھے پر جھولتی ہوئی ننھی سی جان۔ وہ آنکھوں میں شرارت کی چمک لئے منھ چڑاتا ہوا تھا۔ اور وہ پریکٹیکل بک خرید کر بھاگتا ہوا اک طفلک نادان ۔۔۔ ایک خوبصورت سا آہو۔۔۔

.... آگ جو فستح کے جھنڈے لے کر نکلی تھی۔ قلعے پر قلعے سر کرتی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جنگل کے راج سنگھاسن پر بیٹھ چکی تھی ———— آگ کا جنگل ————

سنہ ۱۹۷۰ء

——— ✣ ———
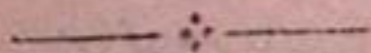
قصّہ حجام کے ساتویں بھائی کا

خداوند میرا ساتواں بھائی نحیف و زار گویا ہڈیوں کا پنجر تھا، آنکھیں اس کی الٹے قدموں اندر کی طرف جا رہی تھیں اور چہرے پر نوکیلی ہڈیاں ہی ہڈیاں دکھائی دیتی تھیں۔ میرا بھائی گو بچتے طوفانوں اور کڑکتی بجلیوں سے سخت خوف کھاتا تھا اور ہر آن ایسی سمتوں کی تلاش میں رہا کرتا تھا جہاں طوفانوں اور بجلیوں سے اس کا دل نہ ہولے۔ اس سبب سے اُسے 'بیزارہ' کہتے تھے۔

میں اس کی اس حرکت سے ہمیشہ نالاں رہتا اور اسے وہ قصّے سناتا جو سینہ بہ سینہ ہمارے خاندان میں چلے آ رہے تھے اور یہ کہتا کہ خدا کی اس پھیلی ہوئی دنیا میں اِس کنارے سے اُس کنارے تک ہر جگہ طوفان آتے ہیں، ہر جگہ بجلیاں کڑکتی ہیں اور ہر جگہ شعلے بلند ہوتے ہیں اور یہ کہ آفاتِ ارضی و سماوی سے کہیں بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔

تب ایک روز بڑا گہرا طوفان آیا، گرد و غبار بھاری بھاری جسموں کے تئیں کوچہ و بازار میں گھس آئے پھر وہ ہماری دہلیزوں میں داخل ہو گئے اور دیر تک ہماری حویلیوں میں دندناتے پھرے۔ اتنے ہی میں بجلیاں چمکیں، بادل گرجے اور جنگلی ہاتھیوں کے غول آسمان پر بے محابا دوڑتے پھرتے دکھائی دیئے۔

ایسا مہیب منظر کب کسی نے دیکھا تھا۔ اس لدے پھندے آسمان نے کچھ ہی دیر میں برسنا شروع
کیا اور کئی دنوں تک مینہہ برستا رہا۔ راستے پانی سے بھر گئے۔ رسل و رسائل کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔
ہر کس و ناکس اپنی اپنی حویلیوں میں مقید ہو گیا اور غریبوں نے کئی کئی وقت کے فاقے کھینچے۔۔۔
بعد کئی دنوں کے بجلیوں نے اپنے پر سمیٹے، آسمان نے اپنی سیاہ چادر اُتار پھینکی، مینہہ تھما اور راستے
کسی قدر صاف ہوئے تو ایک دن میرا بھائی سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی، میرے پاس پہنچا اور اس نے مجھے
بتایا کہ وہ اپنی آبائی حویلی معہ پائیں باغ کٹہرے اور اپنی بزازی کی دوکان بیچ کر دوسرے شہر کی طرف جا رہا ہے
کہ وہاں نہ تو اس زور کے طوفان آتے ہیں، نہ ایسی سرکش بجلیاں چمکتی ہیں اور نہ ایسے بدمست بادل
گرجتے ہیں۔ برعکس اس کے وہاں بڑے ہی خوش خرام دریا ہیں، جن کا پانی دل کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور
بے حد سود مند ہے۔ جہاں سبزہ و گل کی فراوانی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتی ہے اور جہاں فضا میں
نغمے ہی نغمے بکھرے پڑے ہیں۔

خداوند —— میں نے یہ سُن کر اس سے کہا کہ جان برادر تو اس ارادے سے باز آ، اور زنہار
وہاں کا قصد نہ کر کہ اس میں سراسر دل و جان کا زیاں ہے، اور حال تجھ پر تیرے دوسرے بھائیوں کی ناعاقبت
اندیشیوں کا عیاں ہے۔ لیکن اس نافرجام پر تو جیسے کسی نے سحر کر دیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں سبز خواب
بسائے بس ایک ہی قصّہ کو دہراتا رہا ——
میں نے اسے ڈرایا دھمکایا۔ بہت سی مثالیں ایسے لوگوں کی دیں جنھوں نے ترک وطن کر کے سخت
رنج اُٹھایا۔ باپ دادا کی گڑی ہڈیوں کی قسمیں دیں لیکن وہ ناہنجار کسی قیمت پر نہ مانا۔ اور اپنے ارادے
پر اٹل رہا ——
وہ چلا گیا اور میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ زندہ رہا تو مقرر اسے کبھی نہ کبھی اپنے خون
کی یاد آئے گی اور وہ واپس آ کر مجھ سے ملے گا۔
بعد ایک مدت کے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایک قافلہ دریاؤں کی دوسری جانب سے آیا ہے۔ میں نے
اس غرض سے کہ مبادا ان سے بھائی کی کوئی خبر ملے، اس قافلے سے ملنا ضروری سمجھا۔
ان میں سے ایک پیر مرد نے کہ میرے بھائی کے حالات سے کماحقہٗ واقف تھا، مجھے بتایا کہ میرا

بھائی ایک دن اپنی راہ پر چلا جاتا تھا کہ ناگاہ اس نے دیکھا کہ جلوس ایک شاہزادی کا بڑے کروفر سے چلا آتا ہے شاہزادی نہایت ہی حسین و جمیل تھی کہ اس کے رخساروں پر تازہ صبح کھل رہی تھی، اس کی آنکھوں میں کتنے ہی سوتے جاگتے قصے دم لے رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر بجلیاں سی کوندرہی تھیں اور شانوں پر سیاہ گھٹائیں اتری تھیں۔ سیمیں تن و خوش اندام بڑے ہی غرور و تمکنت سے اپنی سواری پر چلی آتی تھی اور اسکے پہلو میں ایک شاہزادہ خوبرو مسند نشیں تھا جو اپنی وضع قطع اور لباس و آداب سے اجنبی دکھائی دیتا تھا۔ اور وہ شاہزادی معشوقہ دلنواز کہ حسن میں سارے روئے زمین پر اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ نہایت ہی بیش قیمت زرنگار پوشاک میں ملبوس تھی۔ پیچھے اس کے خواصوں اور لونڈیوں کی صفیں تھیں کہ سب ایک سے ایک قیمتی لباس میں ملبوس تھیں اور ایک سے ایک حسین و جمیل تھیں۔ پھر چند ایک صفیں خواجہ سراؤں کی تھیں اور پیچھے ان کے خلقت کا اژدہام تھا جو اس جلوس کے ساتھ ساتھ چلا آتا تھا۔

بیزارہ شاہزادی کو دیکھ کر ہزار جان سے فریفتہ ہوا، اور ایک ساعت کے لئے اس نے اپنی گردن جھکا کر دیکھا کہ ایک شیریں اور مصفا پانی کا چشمہ ہے جو گاتا بجاتا رواں دواں ہے۔ خداوند تب میرے بھائی کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی اور اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو جلوس قریب آچکا تھا۔

میرا بھائی پہلے شہزادی کو مجرا بجالایا، بعد ازیں اس نے شاہزادے کو جھک کر سلام کیا اور جب وہ شہزادے کو سلام کر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ارد گرد کے شہری اپنی داڑھیاں مٹھیوں میں دبائے، سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔

بیزارہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں قیام کر گیا، اور بعد چند دنوں کے اس نے اپنے تئیں شاہزادی کے عشق میں اس طرح گرفتار پایا کہ چھوڑ جانا شہر اس محبوبہ ستم طراز کا اسے ناممکن سا نظر آیا اور دوسرے بندگان خدا کی طرح اس نے بھی شاہزادی کے عالیشان محل کے زیر سایہ پناہ لی اور چوک میں ایک دوکان لے کر پیشہ بزازی کا کہ اس سے بخوبی واقف تھا شروع کر دیا۔

بیزارہ اپنے روز و شب سے مطمئن تھا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجالاتا تھا کہ اس نے اسے ایسی حسین و جمیل اور خوش خصال شاہزادی کے سایہ میں پناہ دی، اور ہر روز اس کے شربت دیدار سے دل و جان میں توانائی سی محسوس کرتا۔ اور بجز اس رنج کے کہ اہل شہر ایک ایسی زبان بولتے تھے جو کہ

ان سمندری ہواؤں کے تھیں جو شائیں شائیں کرتی گذر جاتی تھیں اور جو اس کی فہم سے بالاتر تھیں، اسے کوئی اور رنج نہ تھا۔

پر یہ کہ اسے ان نیک صورت مندروں کو دیکھ کر لرزہ سا طاری ہو جاتا جن کی زبانوں کی آندھیاں اس کے سر سے گذر جاتیں اور جن کی آنکھوں سے وقت بوقت ایسے شرارے پھوٹتے کہ میرے بھائی کو یہ گمان ہوتا کہ وہ ان میں جل کر خاک کا ڈھیر ہو جائے گا۔ اور جب وہ اپنی داڑھیوں کو اپنی مٹھیوں میں زور سے دباتے، تو میرا بھائی جو سخت نحیف و نزار تھا اپنی دھاگے جیسی گردن تیزی سے سہلانے لگتا۔ اس واسطے میرا بھائی محل کے سائے میں بسنے والے، کچھ ہم زبانوں کے درمیان ہی رہتا سہتا اور انہیں میں اٹھتا بیٹھتا۔

تب کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ دریاؤں کے اس شہر میں ایک دن بڑے زور کا طوفان گھروں کے اندر سے اور آبادیوں کے درمیان سے شائیں شائیں کرتا اٹھا۔ میرا بھائی یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا اور تاسف کرنے لگا کہ اس نے ان ہی طوفانوں کے خوف سے اپنے شہر کو چھوڑا اور اپنے آبائی وطن سے منھ موڑا۔

خداوند میرے بھائی نے جو اپنے تئیں سخت مصائب میں گرفتار پاتا تھا کئی کئی وقت کے فاقے کھینچے وہ اپنی بند حویلی میں پڑا رہتا تھا اور اپنے دیدے کھوتا تھا۔

اور جب میرے بھائی نے احوال اس شہر کا بکم و کاست مجھے لکھا تو میں نے چندے توقف کے بعد اسے لکھ بھیجا کہ تو احمق اپنی جان گنواتا ہے۔ اپنے شہر کو لوٹ آ کہ خدا کا دیا یہاں بہت کچھ ہے۔

اس پر میرے بھائی نے لکھا کہ ان دراز ریشوں نے شہر کے دروازے بند کر دیے ہیں اور یہ منادی کر دی ہے کہ جو جہاں ہے وہیں رہے اور رنج و غم اس شہر کا کسی نہ کسی طرح سہے۔

بعد کئی دنوں کے طوفان تھم گیا اور حالات اعتدال کے قریب آ گئے پر یہ کہ ہر مرد و زن نے اس کیفیت کو ایک بڑے طوفان کی آمد سے تعبیر کیا۔

میرا بھائی فرطِ الم سے ادھ موا سا ہو گیا تھا اور ہر لحظہ یہ دعا کرتا تھا کہ تو یہ طوفان اس شہر کی راہ بھول جائیں یا پھر اسے ایسی راہ پر لگا دیں جہاں ایک دائمی سکون کی صورت نظر آئے۔

خداوند جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا شہر والوں کے اندیشے سچ ثابت ہوئے اور وہ طوفان پھر آیا کچھ دیر کو تھما اور پھر ایسا مہیب طوفان آیا کہ بنیادیں تک ہل گئیں۔ سارے دریا ابل پڑے اور دل

پہاڑوں کے دل اُٹھے۔

یہ طوفان جو کوچہ و بازار سے اٹھا تھا بے حد پُر شور تھا، ایسا کہ کان بھی تھے مگر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، آنکھیں تھیں مگر دیکھنے کو اتنا کچھ تھا کہ دکھائی نہیں دیتا تھا، ناک تھی مگر تعفن اس بلا کا تھا کہ سنگھائی نہیں دیتا تھا اور زبان تھی مگر دہن میں اتنا غبار جمع تھا کہ بولا نہیں جاتا تھا۔

شاہزادی نے اہل شہر کی ایما پر اس اجنبی اور خوبرو شاہزادے کو یہ کہہ کر محل سے باہر نکال دیا کہ مگر اسی کی بدبختی سے یہ طوفان آتے ہیں۔ پھر اسے ننگ و رسوا کر کے اسے اس کے غلاموں اور خدمتگاروں کے ساتھ شہر بدر کر دیا۔

شہر کے دروازے بند تھے۔ ان بازاروں میں جہاں شب و روز کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور جو بڑے پُر رونق تھے، اب خاک اُڑتی تھی اور وہ بازار چیلوں اور گِدھوں کا مسکن بن گئے تھے اور درندے بے محابا ہر طرف سر اٹھائے پھرتے تھے۔

بس ہر طرف سائیں سائیں کا شور تھا جو کہیں 'واہ' پر ختم ہوتا اور کہیں 'آہ' پر ——

میرے بھائی کا روزگار تباہ ہو گیا اور وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہو گیا۔ وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال اپنی حویلی میں بند پڑا رہتا تھا اور اپنی نادانی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتا تھا کہ طوفانوں کے خوف سے اس نے ناحق اپنا شہر چھوڑا اور بزرگوں کے اس قول کو فراموش کیا کہ طوفان ہر شہر میں آتے ہیں اور بجلیاں ہر مقام پر کڑکتی ہیں ——

تب ایک دن دراز ریش شہریوں کا ہجوم تیز جھکڑوں کی آوازیں بلند کرتا اس کی حویلی کے سامنے اُمڈ کا۔ ہجوم نے زبردستی حویلی کا پھاٹک توڑا اور اس میں سے بزازہ کو کھینچ نکالا۔

میرے بھائی نے ہزار منت و سماجت کی۔ ان کے پاؤں پہ سر رکھ کر گڑگڑایا لیکن وہ نابکار کسی حالت میں نہیں مانے اور یہ کہہ کر اسے میدانوں میں گھسیٹ لے گئے کہ شاہزادی تمہاری اور تمہارے جیسے بندگانِ خدا کی تصویریں کھینچ کر اپنے نگار خانے میں لگائے گی۔

یہ سُن کر میرے بھائی کو عشوہ طرازیاں شاہزادی کی یاد آگئیں اور ان بے ایمانوں کی باتوں کو دھیان میں لا کر بولا کہ صاحبو مجھ پر کئی دنوں کا فاقہ ہے اور صورت اب کوئی چلنے پھرنے کی دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اور

بہ سبب نقاہت بولا تک نہیں جاتا ہے۔

تب ایک سفید ریش کے اشارے پر ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے اپنی جھولی سے دو سوکھی روٹیاں اور تھوڑی سی کھجوریں برآمد کیں اور ایک چھاگل سے پیالے میں پانی بھر کر اسے پیش کیا۔ شہزادے نے کہ کئی وقتوں کا بھوکا تھا ان سوکھی روٹیوں کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور خوب سیر ہو کر کھایا اور شکر خدا کا بجا لایا۔

بعد اس کے اسے اُس میدان میں لے آئے جہاں اس جیسے کتنے ہی بندگانِ خدا صفیں بنائے کھڑے تھے اور سامنے ان کے شاہزادی تصویریں کھینچنے والا آلہ لئے کا ہے ان صفوں کو دیکھتی گاہے آلے کے اندر جھانکتی اور یوں گمان ہوتا تھا کہ صفیں بڑی ہوتی جاری ہیں اور آلہ چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔

وہ تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے بے دم سے ہو گئے کہ ان میں سے بہتیرے ایسے تھے کہ کئی کئی وقت کے فاقے سے تھے۔ اتنے ہی میں شاہزادی نے چشم و ابرو کے اشارے سے انھیں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھنے کا حکم دیا ــــ وہ سامنے کے منظر میں اتنے گم تھے کہ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور یوں ہی کھڑے کھڑے بیٹھ گئے اور تب ان مکار دراز ریشوں نے جو ان کی پشت پر کھڑے تھے بڑی پھرتی سے ان کی کرسیاں کھینچ لیں اور وہ دھم سے زمین پر آ رہے۔ ان نا خدا ترسوں نے کرسیوں کے نیچے دہکتی انگیٹھیاں روشن کر دی تھیں۔

خداوندا انھوں نے بڑی دلدوز چیخیں بلند کیں اور اِس سرے سے اُس سرے تک ایک قیامت کا سماں بندھ گیا۔

وہ آہ و زاری میں کھوئے تھے کہ سامنے سے شاہزادی اٹھلاتی سو ناز و نخرے دکھاتی ان کے پاس آئی اور اپنے لبوں پر تبسم لا کر کمالِ محبت سے بولی کہ یوں بیٹھا جاتا ہے، تم پر لازم تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے۔

تب اس نے دراز ریشوں کو حکم دیا کہ وہ انھیں بازو پکڑ کر اٹھائیں چنانچہ وہ جو زخموں سے چور تھے دوبارہ اٹھائے گئے۔

شاہزادی نے وہ آلہ پھر ٹھیک کیا اور دھوپ کی تپش اور زخم کی شدت سے آن کی آن میں وہ پسینے سے شرابور ہو گئے۔

یہ دیکھ کر اس کا فرادا نے انھیں دربارہ بیٹھنے کا حکم دیا اور ان باشندوں نے پہلے کی طرح اس بار بھی کرسیاں کھینچ لیں وہ فی الفور زمین پر آرہے اور انھوں نے بڑی لرزہ خیز صدائیں بلند کیں۔

اور بار بار کے اس عمل سے جب وہ نڈھال ہو گئے اور طاقت اٹھنے بیٹھنے کی بالکل ہی سلب ہو گئی تو انھیں میدان کے ایک کونے میں لا پھینکا گیا۔ اور دراز ریشوں نے زبان کی شمشیر چلاتے ہوئے کچھ حکم سنایا جسے وہ بہ سبب اپنی لاعلمی کے قطعی نہیں سمجھ سکے۔

پر یہ کہ جب وہ بھوک اور زخم کی ٹیس سے تڑپ اٹھتے تو ان کے حکم کے بموجب انھیں دو سوکھی روٹیاں کچھ کھجوریں اور پیالے میں تھوڑا سا پانی دیدیتے اور ان کے زخموں پر کسی طرح کا لیپ لگا دیتے۔ لیکن جب ان کے زخم بھرنے لگتے تو پھر ان پر انگارے رکھ کر انھیں جگا دیا جاتا۔ وہ چیختے چلاتے، پھوٹ پھوٹ کر روتے لیکن ان شقی القلبوں پر ان کی آہ و بکا کا مطلق کوئی اثر نہ ہوتا اور ان کی مذموم حرکتیں شدت اختیار کرتی جاتیں۔

خداوند جب میں نے بیزارہ کا یہ حال سنا تو میں تڑپ اٹھا اور بے حد سراسیمگی کے عالم میں اسے دیکھنے کو چل پڑا لیکن جب قریب شہر کے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ خلقت کا ایک اژدہام تھا جو اپنی نظریں اٹھائے اس شہر کو تک رہا تھا جو ہر چہار طرف سے بند تھا، جہاں ہمہ وقت آسمان کو چھو دینے والی آہ و بکا بلند ہوتی تھی، جہاں کی خاموشی پر گور غریباں کی خاموشی کا گمان ہوتا تھا: جہاں ہر لحظہ چیختے اور سر دھنتے ہوئے دھوئیں اٹھتے تھے، اور جلتے ہوئے گوشت کی بو ہر سو پھیل جاتی تھی اور ایسے قہقہے شہر کی دیواروں سے ٹکرا کر چار دانگ عالم میں گونج جاتے تھے۔

خداوند یہ حال دیکھ کر اس شہر عجیب کا میرے قدم وہیں تھم گئے اور ایک کھلی جگہ دو زانو ہو کر میں نے بارگاہ ایزدی میں یہ دعا کی کہ بارِ الٰہ اگر بیزارہ اب بھی گھُٹ گھُٹ کر جلتا ہے تو بہتر ہے کہ تو اسے موت ہی دیدے ——

۱۹۷۱ء

——·∘·——

خبرِ دشت و بیاباں کی

یوں سمجھو کہ ایک سونے کا شہر کہیں سے وہاں آگرا تھا۔

ایسے میں میں نے اس سفر میں کہ سفر تھا اور سفر نہیں تھا ایک جگہ رُک کر دیکھا کہ کہیں دھوپ
اپنے پَر سمیٹ رہی تھی، کہیں شفق پھوٹنے کا منظر تھا، کہیں وہ اُجالا تھا جو آتے ہوئے اندھیرے پر
فتح حاصل کرکے قائم رہتا ہے، کہیں وہ اُجالا تھا جو جاتے ہوئے اندھیرے کو زیر کرکے آتا ہے۔

میرے دل میں عقیدتوں کا سیلاب سا اُمنڈ آیا اور میں نے سوچا یہ تو عبادت کی جا ہے۔

اور وہ جو بے پناہ گہری تھیں، ہلکورے کھاتی ہوئی، جن سے ہر وقت ایک کیف سا، ایک سرور سا
قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا میرے لئے لطف و انبساط کا سامان مہیا کر رہی تھیں۔

شہر کے دو میکدے۔

ان میکدوں کا گدا بننا بھی تو مقدر کی بات ہے!

وہ قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا میکدہ۔ وہ اوپر جاتی ہوئی، نیچے جھکتی ہوئی چھاؤں۔ کیا وجد آفریں
سماں تھا۔۔۔

وہ چمکتی سیاہ محرابیں ـــ فریب نظر تو اسے ہی کہتے ہیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیاہ محرابیں دو آبدار تلواریں بن گئیں ـــ

میں نے بڑھ کر اپنی گردن پیش کر دی۔

اور وہ ایک روشن سی لوح تھی۔ یہیں اس شہر کا نام کندہ ہے، یہیں اس شہر کی تاریخ درج ہے۔

چلتے چلتے میرا جی چاہا کہ ان میدانوں میں گھڑی دو گھڑی کو دم لے لوں کہ ساری زندگی تو سکون کی تلاش میں گذر گئی ـــ

تب ہی نشیب کی طرف جاتی ہوئی وہ دیوار نظر آئی۔ بڑی متوازن سی، سیدھی سی ـــ جیسے گرمیوں میں ایک خنک سائے کا احساس، جیسے سردیوں میں ایک بے حد لطیف سی آنچ کا قرب ـــ

اور وہیں تازہ بہ تازہ کسی خنجر سے تراشی ہوئی دو قاشیں تھیں ـــ ایک بے نام سی لذّت جو پیچ آلودہ قاشوں میں ہوتی ہے۔ ایک تیز سا ذائقہ جو جوان خون میں ہوتا ہے۔

یہ بے نام سی لذّت، یہ تند و تیز سا ذائقہ ـــ تا آنکہ ایک عمر گذر جائے۔

اور وہ گہرا کنواں جہاں تھکے ماندے ٹھنڈے پانی کا لطف حاصل کر رہے تھے۔

تازہ دم ہو کر میرا جی چاہا کہ گردن مینا میں اپنے بازو حمائل کر دوں ـــ

پھولوں سے لدی پھندی ـــ

ان آگ برساتی چوٹیوں کے سائے میں نیند آسکتی ہے؟

بڑے پریشان سے خواب۔ بڑے گہرے خواب ـــ

میرے ہاتھوں میں کہیں سے گرم گرم کبوتروں کی لذّت ابھری۔ کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ جاتے، میں انہیں قابو میں کرتا۔ اس طرح وہ بار بار نکل جاتے اور میں انہیں بار بار اپنے قابو میں کرتا ـــ

اور وہیں دو شاخیں تھیں، صندلی ـــ خوشبوؤں میں لپٹی جن کے آخری سرے پر وہ تیز اور نوکیلی شعاعیں تھیں جن میں جل جانے کو جی چاہتا تھا۔

جلتا بھنتا میں دوبارہ ان ہی کبوتروں کے پاس جا پہنچا۔ اور پھر وہی کھیل۔

اور تب نیچے اترتے ہوئے ایک زعفرانی قطعہ نظر آیا مجھے ہنسی آتی تو وہ بھی کھلکھلا اٹھتا۔

پھر کئی چٹانوں سے گذرتے ہوئے، کئی قوسوں سے الجھتے ہوئے، میں وہاں پہنچا جہاں زندگی سے بھرپور دو ستون ایستادہ تھے ۔

اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آتے ہوئے کئی جنم گذر گئے، کئی صدیاں بیت گئیں ۔

اور تب بالآخر لذتوں کے شہر کا دروازہ کھلا ۔

کئی جنم تک میں نے لذتیں حاصل کیں، کئی جنم تک میں نے خود کو کھویا ۔

اور جب لذتوں کا پیمانہ چھلک اٹھا تو میں سیاہ بادلوں میں جا چھپا اور وہاں دیر تک سوتا رہا ۔

اُٹھا تو میں نے چپکے سے شہر کو خبر دی ۔

'شہر تو نے مجھے آباد کیا ہے' ۔

لیکن وہ سنہرا شہر اپنی جگہ کھڑا تھا اور میں اپنی جگہ ۔

اور سفر تھا کہ شروع ہو کر ختم ہو چکا تھا اور ختم ہو کر شروع ہو چکا تھا ۔

جانتے ہو اس شہر میں بسنے والا دس ملین کا آدمی ہے ۔

لیکن وہ وہاں نہیں تھا ۔ تب میں نے اُسے جھنجھوڑا ۔

'میرے دوست تم کہاں ہو، کیا حال ہے تمہارا ؟'

اور تب اُس نے یکایک چونکتے ہوئے دریافت کیا ۔

'کیا کہا تھا تم نے دس ملین کا آدمی' ۔ وہ دیر تک 'دس ملین' 'دس ملین' کی رٹ لگاتا رہا ۔

'اور تم نے اسے دیکھا کب تھا ؟'

'میں نے ؟ ۔ یوں سمجھو ہزاروں سال پہلے، صدیوں پہلے، بس کل ہی، بس ابھی ابھی ۔

اس روز و شب کے سیال کے متعلق کوئی حتمی بات کہی بھی تو نہیں جا سکتی کہ یہاں 'ابھی'، 'کبھی' ہے اور 'کبھی'، 'ابھی' ۔

'میں نے بھی اسے کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا'، کہیں خلاؤں سے آواز آ رہی تھی ۔

'تب ہی تو میں اُسے اپنی پسلیوں سے پیدا کرتا ہوں اور پھر وہی سارے مراحل ۔ جو پیاس کو اور بھی بھڑکا دیتے ہیں ۔ جو اس دشت کی فضا کو اور بھی مسموم کر دیتے ہیں ۔

(تم اس رات کا قصہ سنو۔ دوست نے ایک بھیانک سی داستان چھیڑ دی۔ ہم سب دائرہ در دائرہ
صفیں بنائے کھڑے تھے اور پارٹی میں ایک لرزہ خیز منظر کی آمد آمد تھی۔
تب ہی چھناک سے دائروں اور قوسوں نے وہاں ہلّہ بول دیا۔
کھلی کھلی دعوتیں ___ کھلے کھلے بلاوے ۔
ایک بڑی شوخ و شنگ سی رعیتی ہاتھ پکڑ کر کھینچتی تھی کہ بس ان ہی جنگلوں میں آ بسو، پر صفیں
روکتی تھیں کہ کہاں جاتے ہو ان ہی آبادیوں میں رہو۔
اور وہ جو بند تھی اس نے لیموں کے پیڑ کو نغمہ چھیڑ رکھا تھا۔ اور سامنے ایک طائر جو بلندیوں کی سمت
جا رہا تھا۔ دوسرا طائر جو اس کا تعاقب کر رہا تھا اور تیسرا جو اس کا تعاقب کر رہا تھا۔
ہال میں ایک نامانوس سی خوشبو پھیلی تھی اور صفوں کے درمیان وہ جھلک رہی تھی۔
وہ دیر تک رنگین دھجیاں بکھیرتی رہی۔
پھر کیا ہوا سنو گے؟ ___ یار لے تمہیں سننے کا؟ ___
اس کا وجود، تھا مگر کچھ نہیں تھا بجز دائروں، قوسوں اور ایک جھل جھل کرتی مشک کے ___
سب کچھ سراپا آگ، سراپا جھلسا دینے والا۔
میری پتھر کی آنکھیں جیسے وہیں جم گئیں اور میں یہ تک بھول گیا کہ میں ان میں سے ایک ہوں۔
اور پھر چھم چھم چھم چھم ___
لیکن جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوا؟ ___
میں نے کئی رات لوہے کے جلتے ہوئے بستر پر گذاریں۔ ایک آگ جو میرے اندر تھی، ایک آگ
جو چاروں سمت پھیلی ہوئی تھی اور ایک آگ جو بستر کے نیچے بھڑکائی جا رہی تھی۔ میں نے بہت کچھ پانی کا چھڑکاؤ
کیا، ساری پسلیوں کو اس آگ میں جھونک دیا لیکن یار عجیب سی آگ تھی جو کسی طرح سرد ہونے کا نام ہی
نہیں لیتی تھی۔ بارے وقت میری مدد کو آ پہنچا اور وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے
گیا اور اس طرح اس نے مجھے اس آگ سے نجات دلائی۔
"پھر؟" ___ میں نے پسلیوں والے دوست کو ٹٹولتے ہوئے سوال کیا۔

سچ پوچھو تو عافیت اسی سفر میں ہے۔

'لیکن بھائی'۔ تب ہم نے اپنے اپنے سفر کے تجربے بیان کئے۔

دوست نے کہا۔ 'اس لمحے میں تھا مگر میں نہیں تھا۔

اور میں نے اُس پر گرہ لگائی۔ 'اُس لمحے وہ تھی مگر وہ نہیں تھی'۔

'اس فریب کو وہ جانتی ہے؟'۔

کیا کہا جا سکتا ہے۔ کوئی دو ٹوک رائے دینے کے لئے ہمیں ہزاروں سال کی راہ طے کرنی ہوگی۔

یہ سفلہ پن!

اور جب وقت گہری تاریکیوں میں ڈوب گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ 'تم؟۔ پسلیوں والی کو جگاؤ گے؟ — اور تم؟ — وہ ہوگی مگر وہ نہیں ہوگی۔

اس طرح ہم اپنے اپنے دشت اٹھائے دو الگ الگ راستوں پر چل کھڑے ہوئے۔

۱۹۷۲ء

—— ⁘ ——
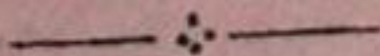
اک جہاں زندانیوں کا

ان میں سے ہر ایک نے اپنے لئے ایک ایک زنداں کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ سب جو ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ یہ ایک جانا بوجھا، سوچا سمجھا عمل تھا، اور اس عمل سے وہ مطمئن ہی تھے لیکن زنداں پھر زنداں تھا۔ اس کی تنہائی اس کی گھٹن بار بار انہیں جسم کی بوٹیاں تک نوچ ڈالنے کی ترغیب دیتی انہیں اس بات پر اکساتی کہ وہ اس حبس کو توڑ کر آزاد فضاؤں میں کھو جائیں۔ کچھ رنگ کا لطف حاصل کریں، کچھ بُو سے حظ اٹھائیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود حبس انہیں یوں پسند تھا کہ باہر انہیں، آسیبی چہرے، کرخت چہرے اور زبان کے زہر بھرے نشتر۔ کھلی کھلی فضا سے بھرپور نفرت کا سبق دیا کرتے۔

ان میں سے ہر کوئی اپنے سینے میں آگ، اپنے سینے میں گنجلگ تحریروں کا دفتر لئے بیٹھا تھا۔ سچ پوچھئے تو انہوں نے یہ زنداں۔ یہ پناہ گاہ تلاش و جستجو کے بعد ہی حاصل کی ہوگی۔

میں میں ہوں۔۔

عافیت بھیڑ میں رہ کر بھی تنہا رہنے میں ہے۔

مجھے کیا لینا دینا کسی سے ۔۔

دنیا جس ڈھب پر چلتی ہے چلنے دو۔

تب وہاں ایک بھیا صاحب آئے جنہیں خاندان کے بزرگ بھی بھیا صاحب ہی کہتے۔ کہا جاتا تھا کہ بھیا صاحب ایسا بہتا پانی ہیں جو نہ کہیں دم لیتا ہے، اور نہ کہیں اپنے لئے کوئی مقام بناتا ہے ـــ بیوی نہیں ـــ بچے نہیں ـــ آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اور اگر ہوتے تو بھیا صاحب کبھی کبھی تو ضرور ان کا ذکر کرتے۔

بھیا صاحب آتے تو انہیں ان کے بند کمروں سے نکالنے کی سعی کرتے، انہیں سمجھاتے کہ وہ فضائے بسیط میں جینے کا لطف حاصل کریں۔ اپنے پروں کو پھڑپھڑائیں اور قفس کی تیلیوں کو موم کر دیں۔ پھر یہ نیلا آسمان، یہ اندھیاں، یہ بادلوں کے سفید گلے ـــ گویا کہ ساری کائنات ان کے قبضے میں ہو گی۔

تب دفتر کے رکسی قدر کھل جاتے۔

"بھیا صاحب اتنا پھیلے ہوئے زنداں میں جینے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی اس چھوٹے سے زنداں میں پڑا رہے کہ یہاں گرمی ہے، اُمس ہے، گھٹن ہے، اکیلے پن کے عفریت ہیں، لیکن اُس زنداں کے مقابلے میں اِس زنداں میں پھر بھی عافیت ہے۔"

لیکن بھیا صاحب کسی نہ کسی طرح ان سبھوں کو ان کے محبس سے کھینچ لاتے ـــ دیکھو اس کھلی فضا میں چیخو، گاؤ اور اپنے سروں میں قہقہے لگاؤ۔

تینوں منزلیں دھیمی آوازوں میں گانا دھیرے اسلنے لگتیں، اچانک بڑے زور کا طوفان آجاتا اور وہ بے تاب ہو کر زور زور سے چیخنے لگتیں ـــ ایسے میں بھیا صاحب مداخلت کرتے ہوئے کہتے۔

"میں چیخنے کو منع نہیں کرتا، لیکن ایک وقت میں ایک ہی منزل چیختی تو بات کچھ بنتی، بات کچھ سمجھ میں آتی۔"

"جانتے ہو بھیا صاحب ان لوگوں نے ہماری گردنوں کو اس زور سے جکڑ رکھا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا دم گھٹ جائے گا۔ ہم گانا چاہتے ہیں، مگر ہم گا نہیں سکتے، ہم چیخنا چاہتے ہیں مگر ہم چیخ نہیں پاتے۔ چڑھی ہوئی تیوریوں نے ہماری آزادی سلب کر لی ہے۔"

بھیا صاحب مسکرا رہے تھے جیسے انہوں نے ساری تیلیاں توڑ دی ہوں، سارے قید و بند ے

آزادی حاصل کرلی ہو۔

بیچ کے زینے والوں نے کہا۔ "ہمیں لگتا ہے کہ ہم خلا میں معلق ہو گئے ہیں۔ نہ ہمارا آگے والوں سے کوئی رشتہ باقی رہا ہے اور نہ پیچھے والوں سے۔ یوں کہ آگے والے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں فراموش کر دیا ہے۔ ہر چند کہ اس جدوجہد کے میدان میں ہم نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ وہ ہماری جڑیں بھی ہیں اور ہماری آخری منزل بھی اور کسی نہ کسی دن ہمیں ان کی جگہ پر کرنی ہے۔ پیچھے والوں کی شکایت آپ سن چکے۔ آخر ہماری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ وہ نو وارد ہیں۔ اگر وہ کسی غلط راہ پر نکل کھڑے ہوئے تو پھر دنیا ہمیں کیا کہے گی۔ مگر صورت حال اتنی بھیانک نہیں ہے جتنی انہوں نے پیش کی ہے۔ بھیا صاحب ہم تو توازن قائم رکھنے میں مارے گئے۔"

ان کی آواز بھرا گئی۔

بھیا صاحب نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور دونوں ہاتھوں سے کچھ ایسے اشارے کئے جیسے انہیں بھی ساتھ دینے کو کہہ رہے ہوں۔

آخری منزل والوں نے کہا۔ "بھیا صاحب ہم تو ان بھوں کے لئے نہایت ہی از کار رفتہ شئے بن گئے ہیں۔ سوچئے کہ اگر اس راہ پر ہمارے قدم نہ آتے تو پھر یہ کہاں ہوتے۔ ہمارے بچے کیا یہ نہیں سمجھتے کہ ہمیں آج بھی ہوا، پانی اور روشنی کی ضرورت ہے۔ انہیں خود یہ احساس نہیں ہوتا ہمیں یہ احساس دلانا پڑتا ہے۔ دونوں صورتوں میں کتنا فرق ہے ذرا آپ ہی سوچئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں یہ چیزیں بس اتنی ہی مقدار میں ملتی ہیں کہ ہم کسی نہ کسی طرح خود کو زیست سے ایک اکھڑا اکھڑا سا رشتہ قائم رکھنے کا اہل بنائے رکھتے ہیں۔ رہے ان کے بچے تو وہ تو ہمیں کوڑے پر پھینکنے کے قابل سمجھتے ہیں۔ انہیں ہمارے بلوغ کا پھل ملنا تھا لیکن وہ تو سرتاسر کانٹے ہیں۔ غالباً ان کے آگے والوں نے انہیں ہمارے متعلق کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔"

محفل میں چاروں اور سے ایک شور بلند ہوا۔ بھیا صاحب نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔

"شکایت کہاں نہیں۔ مگر زمان تو ان کا علاج نہیں۔ اسی طرح بڑھتے رہو، پھیلتے رہو اور روتے رہو۔ ایک دن بالآخر تم جھنے بھی لگ گئے۔"

اس پر ان بھوں نے سوچا۔ بھیا صاحب بھی دیوانے ہیں۔ لیکن پھر انہیں خود ہی یہ احساس ہوا کہ

اس طرح ان کے دل کسی قدر ہلکے ہو گئے ہیں۔

بھیا صاحب ہر دوسرے تیسرے دن سبھوں کو یکجا کر لیتے۔ وہ بھی اپنے کھنچے چہرے لئے آتے۔ تب پھیلی ہوئی کائنات سے ہوتے ہوئے ان کے آگے ٹھہر آتا۔ فانی زندگی کے دکھ درد آتے اور تب ہی کہیں سے اچانک ان کے درمیان وہ آگ آجاتی جس نے انہیں تنہائی کی قید نذر کی تھی۔ کبھی بچے شروع کرتے، کبھی ادھیڑ اور کبھی بوڑھے۔

"ہماری حق تلفی ہو رہی ہے۔"

"ہمارے لئے ایک عدم اشتراک کی فضا قائم کر دی گئی ہے۔"

"ہمارے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں۔"

بھیا صاحب سنتے رہتے، مسکراتے رہتے اور جب فضا کچھ ٹھنڈی ہو جاتی تو کہتے ——— دوستو زندگی ایک طویل المیعاد جنگ ہے اور جنگ میں کبھی فتح ہوتی ہے اور کبھی شکست ———

اور جب بھیا صاحب چلے جاتے تو وہ پھر اپنے اپنے زنداں کو لوٹ جاتے۔

پر ایک جذبہ غالباً ان کے درمیان ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ گھر کے زنداں کا نظام درہم برہم ہو۔ گھر ان کے خیال میں ان کی آبرو تھا، جس کا تحفظ (اپنے اپنے زنداں میں رہ کر بھی) ان کے لئے بے حد اہم تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ یکجا ہو کر کبھی چیخ پکار، کسی تصادم سے گھبراتے تھے کہ ان حالات میں گھر کے بکھرنے کا ڈر تھا۔

کافی عرصے بعد بھیا صاحب پہنچے تو انہوں نے ایک زوردار ہانک لگائی۔

بھائی صاحب، عزیزو اور بچو ———

زنداںیوں نے اپنے اپنے زنداں سے نکل کر دیکھا کہ بھیا صاحب ایک اٹیچی لئے اپنی پرانی وضع قطع میں کھڑے ہیں۔

سبھوں نے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ تب ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی قید سے تنگ آ کر دیر سے ایک ایسے فرد کا انتظار کر رہے تھے جو انہیں ان کی قید سے آزادی دلائے ——— ایک نجات دہندہ ———

دوسرے ہی دن سے بھیا صاحب پھر اپنی خدمت پر مامور ہو گئے۔

"دیکھئے بھیا صاحب یہ ہوا تھا ۔۔"

"دیکھئے بھیا صاحب ہم یہاں کے حالات سے کس قدر تنگ ہیں ۔"

"دیکھئے بھیا صاحب یہ یہاں کے لیل و نہار ہیں ۔"

بھیا صاحب سارے وقت مسکراتے رہے۔

"ایک ناتراشیدہ پتھر بھی جب دیر تک گردش میں رہتا ہے تو وہ بھی گول اور مسطح ہو جاتا ہے"۔

بھیا صاحب اب انہیں کھانے کی میز پر لے آتے، اس کے بعد وہ سب نشست کے کمرے میں بیٹھ کر کافی پیتے۔

تب ایک دن ایک حیرت ناک واقعہ پیش آیا۔ ایک نے کھانے کے دوران یہ دریافت کیا کہ ۔ "دادا جان آپ کی کھانسی اب کیسی ہے"۔ اور منجھلے بیٹے نے چونکتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھایا۔

"ہاں ابا آپ اپنا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔"

اور بوڑھا یوں مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "یہ تم بول رہے ہو یا بھیا صاحب کا جادو بول رہا ہے ۔"

اور اسی ساعت انہوں نے زنداں کی سلاخیں ٹوٹنے کی آواز سنی۔

لیکن جب صبح سویرے گھر کا نوکر بھیا صاحب کو چائے دینے گیا تو اس نے دیکھا کہ بھیا صاحب اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔

گھر میں ایک کہرام مچ گیا ۔ "بھیا صاحب چل بسے ۔"

انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے زنداں کی ساری سلاخیں یکلخت ٹوٹ گئی ہیں، کہ ان کے زنداں کی ساری سلاخیں اور بھی مضبوط ہو گئی ہیں ۔

اور جب ذرا طوفان تھما تو یہ سوال اٹھا کہ بھیا صاحب کون تھے ؟ ۔

گھر کے بزرگ نے کہا "بھیا صاحب، بھیا صاحب تھے۔"

کون تھے ؟ کہاں کے تھے ؟ ۔

تب انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے مسائل اور اپنے زنداں کے مسائل میں اس قدر الجھے رہے کہ انہوں نے آج تک یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی بھیا صاحب کون تھے، کہاں کے تھے۔۔

'حیرت ہے سخت حیرت ہے'۔ بزرگ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

ان کے ایک لڑکے نے کہا۔ "ابا تعجب ہے کہ آپ بھی کچھ نہیں جانتے"۔

تب ہی کسی نے تجویز پیش کی کہ ان کی اٹیچی کھولی جائے۔ ہر چند کہ یہ ایک غیر اخلاقی فعل تھا لیکن اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا۔

اٹیچی کھولی گئی ۔ کارڈیوگرام کی رپورٹ، چند ایک نسخے، چند ایک دوائیں، چند ایک کپڑے اور ایک خط جسے شاید انہوں نے رات کے کسی لمحے میں لکھا تھا اور جس کے قریب ایک سادہ لفافہ بھی رکھا تھا۔

"بیٹی ——— میں ساری زندگی اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ تمہاری ماں کو اپنے وجود کا ایک حصّہ سمجھوں، پر عمر کے اس موڑ پر پہنچ کر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس کوشش میں خواہ مخواہ اپنی زندگی برباد کی۔ ساری زندگی ہم لوگ الگ الگ راہوں پر چلتے رہے، اور اگر تم نہ ہوتیں تو الگ الگ راہوں کا یہ رشتہ بھی کب کا ختم ہو چکا ہوتا ——— میں یہاں دو چار دن رہ کر لوٹ آؤں گا"

سبھی آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھے۔

'وہ اجنبی ہو کر بھی ہمارے قلب و جگر تھے'۔

'کیا خوب آدمی تھے'۔

'اپنی آگ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہماری آگ بجھانے آجایا کرتے'۔

کبھی کبھی انسانوں کی صف میں فرشتے بھی آ بیٹھتے ہیں۔

تب ہی ایک لڑکے نے روتے ہوئے اعلان کیا کہ۔

'بھیا صاحب سخت فراڈ تھے'۔

سنہ ۱۹۷۳ء

——— ٭ ———

بدلتے تیوروں کا سورج

بچے نے آکر خبر دی کہ شام کے ڈوبتے سورج نے اپنا رنگ بدل لیا ہے، اور لوگ اُسے دیکھنے کے لئے بڑی تعداد میں سڑکوں پر، گلیوں میں اور مکانوں کی چھت پر نکل آئے ہیں۔ پہلے تو میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی، لیکن اس کے بے حد اصرار پر مجھے جھکنا ہی پڑا۔

چھت پر جاکر میں نے دیکھا تو مجھے سورج ایک ایسا کھلا ہوا تربوز دکھائی دیا، جس میں جا بجا سیاہ بیج بکھرے پڑے تھے، اور جو ٹخنوں بھر پانی میں تھا۔ یکایک مجھے ایسا لگا کہ وہ سناٹے میں کھڑا عرقِ انفعال پونچھتا جا رہا ہے، لیکن دوسری ہی ساعت غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تیز جھکڑوں میں کھڑا چہرے کی گرد پونچھ رہا ہے، اور چہرہ ہے کہ تیزی سے رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ گہرا، گہرا اور گہرا ——— قرمزی، قرمزی اور قرمزی ———

میں نے بچے سے کہا "طوفان آرہا ہے" ———

تب اس نے مجھے ہندسوں کی بات بتائی۔ اسی طرح ایک، آٹھ، پانچ، سات، ابھی مل کر اکیس[۲۱] ہوتے تھے، اور ایک، نو، چار، سات بھی۔

میں نے اس کی بات غلط ثابت کرتے ہوئے بعض سے معصوم ہندسوں کی طرف اشارہ کیا، جو آپس میں مل کر اکیس ہوتے تھے۔

لیکن اس نے بڑے قطعی انداز میں کہا کہ اس نے کئی جگہ یہ بات سنی ہے اور یہ بات جھوٹ نہیں ہو سکتی۔

ان باتوں میں الجھنا لاحاصل تھا ۔۔۔ کیا ہوتا ہے کیا نہیں ہوتا ہے کہ ایسی ساری باتیں تو خدائی فوجداروں کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔

ہاں ایک بات ضرور تجربے میں آئی تھی کہ ادھر کچھ دنوں سے یہ ہو رہا تھا کہ نوکر اگر ایک روپیہ لے کر بازار جاتا، تو وہاں سے کچھ دیر بعد روتا دھوتا لوٹ آتا کہ کسی نے اس کی جیب اس طرح صاف کر دی کہ نوٹ کی جگہ صرف سولہ پیسے رہ گئے۔ کچھ دنوں تک تو ہم لوگ اسے جھوٹا سمجھ کر اس کی سخت تنبیہ کرتے رہے، لیکن پھر اڑوس پڑوس کے لوگوں نے بھی یہی کہانی سنائی کہ گھر کے نوکروں کی جیب سے کوئی آسیبی طاقت ایک روپئے کا نوٹ نکال کر ان میں سولہ پیسے ڈال دیتی ہے۔

یہ سن کر سبھی چہرے زرد ہو جاتے کہ جو وجود سامنے نظر آئے خواہ وہ دیو قامت ہی کیوں نہ ہو اس سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ جو نظر ہی نہ آئے اس سے ۔۔۔۔۔۔۔

اور اسی لمحے ایک صاحب علم نے بتایا کہ یہ چودھویں صدی ہے "قرب قیامت کے آثار ہیں" ایسے میں محیر العقول واقعات کا رونما ہونا عام بات ہو جائے گی، مثلاً اس نے شہر کے ایک تازہ حادثے کے متعلق خبر دی، جس کا وہ چشم دید گواہ تھا کہ ایک شخص کا خون شریانوں اور وریدوں سے بہتے ہوئے اس کے دل میں پہنچا، مگر اب وہ دل سے وریدوں اور شریانوں میں واپس نہیں لوٹ رہا ہے، اور اس کوشش میں کہ خون دل سے لوٹ جائے، مریض کی آنکھیں ابلی پڑ رہی ہیں، دم گھٹا جا رہا ہے اور اس پر سکرات کا عالم طاری ہے۔

گواہ نے بتایا کہ وہاں خلقت کا زبردست اژدہام ہے، اور اترتے ہوئے چہرے، اللہ آمین کرتے ہوئے چہرے، ایک ایک لمحے کو قیمتی سمجھ رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔ اگلے لمحے جانے کیا ہو جائے۔ کیا وہ بچ سکتا ہے؟ ۔۔۔ بہت دور پر انہیں ایک روشنی دکھائی دیتی ہے، جو نزدیک جانے پر فریب نظر بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ سن کر لوگ سوچ کے دریا میں غرق ہو گئے، اور انہیں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ خود ان کی شریانوں کا خون بھی تیزی سے دل کی طرف دوڑنے لگا، واپسی کا سفر بھول جانے کے لئے۔

ادھر ہوا یہ کہ گھر کے کچن ان سے ایک سوال کرتے۔ اگر ایک روپیہ سولہ پیسے بن جاتا ہے تو کتنے روپئے سو پیسے بنیں گے۔

بڑا اہم سوال تھا۔ کسی نے منتروں کے علم کے متعلق بتایا۔ گرو دیووں نے کہا — "سیکھ لو اسے، کچھ تو اس آسیب کی کاٹ ہو۔"

کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہئے۔ چنانچہ لوگوں نے تیزی سے منتر سیکھنے شروع کر دیئے۔ میں نے بھی منتر سیکھ لیا، جس سے ہوا یہ کہ مجھے کچن کا حساب آگیا ——— اگر ایک روپیہ سولہ پیسے بن جاتا ہے، تو کتنے روپئے سو پیسے بنیں گے۔

تب ایک دن دفتر کے مندر کے بڑے پجاری نے مجھے بلا بھیجا۔ "تم نے یہ کار آمد منتر سیکھ لیا، اچھی بات ہے، لیکن اگر چھوٹے پجاری، بڑے پجاری کو نظر انداز کریں، تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟"

اک ذرا دماغ پر زور دینے سے ساری بات میری سمجھ میں آگئی، اور میں نے اسی لمحے منتر کو کچھ اور تیز کر دیا۔

لیکن شہر تو ایسا تھا، جو کبھی سوتا تھا کبھی جاگتا تھا۔ یوں جب وہ جاگا، تو شہر باسیوں نے آپس میں مل کر اس آسیب زدہ ماحول کے متعلق سوچا، جہاں روپیہ جیب میں جاتے ہی سولہ پیسے بن جاتا ہے۔ جہاں دفتر کے مندروں میں یہاں سے وہاں تک، تیز تیز جاپ کرنے والے پجاریوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے ——— اور پھر ایک عجوبۂ روزگار مریض جس کا سارا خون اس کے دل میں کھنچ آیا ہے، اور اب وہ شریانوں اور وریدوں میں واپس ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

حالات بڑے تشویش ناک تھے۔ ان کی آنکھیں کبھی غم میں ڈوب جاتیں اور کبھی غصے میں ——— سوئے اتفاق آنکھوں کے یہ دونوں موسم سرخ ہوتے ہیں۔

تب ایک دن یہ ہوا کہ ان کی آنکھوں کی آگ نے بہت کچھ جلا دیا۔ عمارتیں، دوکانیں اور دفاتر۔ شہر میں آسیب آبسے ہیں، شاید وہ اسی آگ کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوں۔

لیکن آسیب خاک نہیں بھاگے۔ دوسرے دن شہر میں خاکی وردیاں تھیں، بھاری بھرکم بوٹ تھے، سنگینوں کی لپلپاتی زبانیں تھیں، اور زمین کے سینے کو کچلتی ہوئی دیو قامت گاڑیاں تھیں۔

وہ لڑکا جو قصبے سے امتحان دینے شہر آیا تھا۔ نل پر کھڑا پانی پی رہا تھا کہ تڑ تڑ تڑ کی صدائیں گونجیں اور وہ اپنی کھوپڑی کھو بیٹھا۔

اور وہ جو دکان کے اوٹے پر بیٹھا مونگ پھلی بیچ رہا تھا — تڑ تڑ تڑ — اور وہ بہت سا خون بہاکر، ہاتھ پاؤں کھینچتا ہوا ایک طرف کو لڑک گیا۔

ایک جانب ایک مزدور اپنے سر پر اینٹیں سجائے مچان پر چڑھا جا رہا تھا — تڑ تڑ تڑ — اور دوسری ساعت وہ خاک و خون میں لتھڑا پڑا تھا۔

ادھر مائک پر اعلانات ہو رہے تھے — اب سے بائیس گھنٹوں تک — اب سے بائیس گھنٹوں تک —

باہر سڑک پر بوٹوں کی بازگشت تھی، سناٹے کے دل کو چیرتی ہوئی سنگینوں کی جھنکار تھی اور دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی بھاری بھرکم گاڑیوں کا نغمہ تھا —

اس دور سے اس دور تک — اس دور سے اس دور تک —

میں نے بیوی سے پوچھا — 'کیا کیا جائے، اس حبس میں تو دم گھٹ جائے گا'۔

اس نے جواب دیا۔ 'کتابیں ہیں، قلم ہے، کاغذ ہے اور یہ آکاش وانی ہے'۔ لیکن لب و لہجہ کہتا تھا کہ 'کیا میری کوئی اہمیت نہیں'۔

بائیس گھنٹے بہت تھے۔ ان میں سے ہر ایک کام، کچھ دور چل کر تھک جاتے۔ اب آگے کے سفر کے لئے کسی اور کو لے لو —

شام ڈھلے آکاش وانی نے بہت کچھ سنایا۔ بائیس گھنٹے گذرنے کے دو گھنٹے بعد ہی ایک نئی میعاد شروع ہو گئی — قید و بند کی یہ سختیاں کچھ اور شدید ہو گئیں —

بائیس گھنٹے گذرے تو بیوی نے کہا — 'چوکرا بازار سے سبزی لانے جا رہا ہے۔ آپ یہ چیزیں لے آئیں'۔ اس نے ایک پرچی بڑھاتے ہوئے کہا —

روشنائی کی ایک شیشی — صابن کی ایک ٹکیہ — اور جھنڈر سنگھ کے پاپڑ — اس فہرست میں میں نے بلیڈ کا اضافہ کر دیا اور تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔

'آپ اچھے تو ہیں'—

'شکر ہے خدا کا — میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکا' بس آگے ہی بڑھتا گیا۔ یوں ملنے والے ملتے رہے، لیکن میرا تو ایک ایک لمحہ قیمتی تھا — شہر کا ایک چکر لگانا — چھوٹی موٹی خریداریاں کرنا اور وقت سے کچھ پہلے گھر لوٹ آنا۔

اہلِ تجارت کے ایک دفتر میں ہر طرف شکستگی بکھری پڑی تھی اور آنچ اب بھی کسی قدر ٹوٹی پھوٹی سانس لے رہی تھی۔

آگے ایک جلا بھنا ریستوراں —

صفائی کے دفتر میں سارے دن آگ کا وحشیانہ رقص ہوتا رہا تھا، اور اب کہیں پھٹی دیواریں تھیں، کہیں گری پڑی چھت تھی اور کہیں جلی ہوئی الماریاں اور جلے فرش۔

میں نے جیب سے کاغذ نکالا اور پھر نمبر ۱ تا نمبر ۴ خریداریاں کر ڈالیں۔

گھر پہنچا تو بیوی نے کہا۔ "آپ نے تو جیسے اس آسیب زدہ شہر کو نہ چھوڑنے کی قسم کھا رکھی ہے" — تب اس نے بتایا کہ آج آسیب نے نوکر کی جیب میں ایک روپے کے نوٹ کی جگہ صرف بارہ پیسے چھوڑے۔

"صرف بارہ پیسے — یہ آسیب کیا صفر ہی پر جا کر دم لے گا"—

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب کوئی نیا منتر سیکھنا ہوگا — یہ منتر تو بیکار ہوتا جا رہا ہے —

ویسے تک ہم خود میں گم رہے — یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ بہت سی مایوسیاں ہیں جو بوچھتی ہیں، ہم اپنے اندر ان سے جنگ و جدل کرتے رہتے ہیں — وہ کسی طرح سر نہیں ہوتیں اور بالآخر ہم تھک ہار کر کچھ منصوبے وضع کرتے ہیں اور آپ ہی آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ منصوبے ان مایوسیوں کو خاک میں ملا دیں گے۔

بیوی کھڑکی کے دراز سے جھانک رہی ہے۔ فضا ہو وردیاں زور زور سے اپنے بوٹ بجا رہی ہیں۔ کھٹاک کھٹاک، سنگینوں کی پوزیشن بدل رہی ہیں، اور پہاڑ جیسی سُست رفتار گاڑیاں جن سے اندھیرے

بھی تیزی سے جاتے تھے، دھیرے دھیرے سڑک پر رینگ رہی ہیں۔

'یہ سب کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ یہ شہر ہے یا جنگل؟' بیوی نے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ 'جنگل ہمیشہ شہر کے متصل رہے ہیں'۔

'کھٹ ۔۔ کھٹ ۔۔ کھٹ' ۔۔۔۔

وہ مریض جس کے دل میں سارے جسم کا خون سمٹ آیا ہے، اب بھی موت اور زیست کے درمیان معلق سا دکھائی دیتا ہے۔

اور یہ کارخانہ کہ نوکر کی جیب ہر روز نوٹ کی جگہ سولہ پیسے دیکھتی ہے، اور یہ آسیب جو کسی بھی عمل سے شہر چھوڑنے کا نام نہیں لیتا ۔۔۔۔۔

سامنے سورج کا رنگ فق تھا۔ شاید وہ دور سے چل کر آرہا تھا، یوں کہ چہرہ گرد و غبار سے اٹا تھا۔ وہ اسے پونچھتا جاتا تھا، لیکن چہرہ تھا کہ ہر لمحے اپنا رنگ بدل لیتا تھا۔

میں نے بچے سے کہا۔ 'بڑے زور کا طوفان آرہا ہے'۔

۱۹۷۴ء

قیامت کا ایک دن

انہیں اس بات کا قطعی علم نہیں کہ سڑک کہاں سے شروع ہوئی ہے اور نہ یہی معلوم ہے کہ وہ کہاں ختم ہوگی۔ نہ آخری سرا ادھر کا، نہ آخری سرا ادھر کا۔

اس لاعلمی کے عالم میں وہ سڑک کے کنارے چل رہے ہیں جس پر کوئی پختہ فوٹ پاتھ دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اس کی جگہ کچی مٹی کی دبیز تہیں ہیں جن میں پاؤں دھنس جاتے ہیں، اور ہوتا یہ ہے کہ چپل والوں کے پاؤں دھول میں اٹ جاتے ہیں اور جوتے والوں کی جرابیں گندی ہو جاتی ہیں۔

بسیں ہر دو چار ثانیوں کے بعد آتی ہیں لیکن ان پر چڑھنے کی ان میں ہمت نہیں کہ اندر یہاں سے وہاں تک سر ہی سر دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب اندر تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں رہتی تو لوگ بس کے فوٹ بورڈ پر سنبھا سنبھالے اور بس کی پشت پر چند در چند حکمت عملیوں سے خود کو چپکا لیتے ہیں۔ ایسے میں انہیں عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ پیدل چلا جائے، یوں آٹو رکشائیں بھی ہیں، اسکوٹریں بھی ہیں اور ٹیکسیاں بھی ہیں، لیکن ان کی جیب میں سکے کم ہیں اور سڑک تو ایسی ہے کہ جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس کا کوئی بھی سرا گرفت میں نہیں آتا۔

دھوپ اتنی سخت ہے کہ ہر نئی ساعت ان کے چہرے پر ایک نیا داغ ڈال جاتی ہے۔ ان کے ماتھے پر پسینے کی کمی نہیں ہے۔ عورت ہر دس پانچ قدم کے بعد اپنے بلاؤز کے تہ خانے سے ایک چھوٹا رومال نکال کر اپنا منھ پونچھ لیتی ہے اور پھر اسے اسی تہ خانے میں گم کر لیتی ہے۔ مرد اپنی پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اپنی پیشانی خشک کرتا ہے اور پھر رومال مخالف سمت کی جیب میں ٹھونس لیتا ہے۔

سڑک کی ایک جانب سجی سجائی دوکانیں ہیں، ریسٹوراں ہیں، دفاتر ہیں اور رہائشی مکانات ہیں۔ ان کے علاوہ تھوڑی تھوڑی دور پر پٹرول پمپ اور بس اسٹاپ کے شیڈ ہیں، جہاں بسیں ایک سانس سے دوسری سانس کے وقفے تک دم لیتی ہیں اور پھر ہینچتی چلاتی اپنی راہ پر چل کھڑی ہوتی ہیں۔

ان کی عمر کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی کہ وہ نوجوان بھی نہیں ہیں، ادھیڑ بھی نہیں ہیں اور بوڑھے بھی نہیں ہیں، مگر جس طرح سڑک آگے بڑھ رہی ہے وہ بھی آگے بڑھ رہے ہیں کہ یہاں کونسی شے ایسی ہے جو اپنی جگہ ٹھہری ہوئی ہے۔

وہ اپنے دائیں بائیں کے مناظر سے خاصے اکھڑے اکھڑے سے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید یوں کہ انہیں تو بس چلنا ہے اور ان کی جیب میں سکے کم ہیں اور جو سکے ہیں وہ اپنے سینے پر 'بہت ضروری' کی مہر لگائے بیٹھے ہیں، اس لئے دوکانوں سے لینے دینے کا معاملہ ٹلتا ہی جاتا ہے کیونکہ ضرورت انہیں ہر بار یہ کہہ کر آگے بڑھا دیتی ہے کہ راہ میں مجھ سے بھی کوئی بڑی ضرورت آسکتی ہے۔

دفاتر، بینک، پٹرول پمپ —— یہ سارے مناظر ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ رہائشی مکانات —— ہاں انہیں بھی کہیں جاکر ٹھہرنا ہے لیکن وہ کتنی دور ہے، کب آئے گا۔ اس کے متعلق وہ کچھ کہنے سے یکسر قاصر ہیں۔ جب عورت مرد سے پوچھتی ہے کہ وہ گھر کب آئے گا تو وہ کہتا ہے کہ بس آہی چلا —— پھر جب اس کے تھکنے کی باری آتی ہے تو وہ خود بھی زیر لب بڑبڑانے لگتا ہے 'پتہ نہیں کب آئے گا!'۔ اس پر وہ تیز ہو کر کہتی ہے۔ 'ابھی تو کہہ رہے تھے کہ بس آہی چلا'۔

مرد کسی قدر خفیف ہو کر دبی زبان میں کہتا ہے۔ 'تم تو زبان پکڑتی ہو'۔

پر دوسرے ہی لمحے وہ اس حقیقت کے دھاگے کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑ لیتے ہیں کہ اس سڑک پر چلنا ہی اصل کام ہے۔

مرد کہتا ہے۔ لگتا ہے آج بھی تمہارے پاؤں سوج جائیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ تم ان بھاگتی ہوئی بھری بسوں میں چڑھ نہیں سکتیں اور پیدل چلنا تمہارے بس کی بات نہیں۔

اس پر عورت سنگریزوں کے سینے سے ایک مسکراہٹ نکال لاتی ہے۔ " جیسے یہ سب تمہارے لئے بہت آسان ہے "۔

مرد کے لئے یہ مسکراہٹ گویا ٹھنڈے پانی کا چشمہ بن جاتی ہے " شکر ہے کہ تم اب بھی مسکرا لیتی ہو " " باتیں بنانے کو دے دو یہ نہیں ہوتا کہ ..... "

شاید عورت کو اخلاق و مروت کے کچھ بھولے بسرے سبق یاد آ گئے تھے اس لئے یہ جملہ 'کہ' سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

لیکن وہ ایک گھڑی کو بھی یہ نہیں بھولے کہ اس سڑک پر چلتے ہی رہنے میں عافیت ہے بہ ایں عالم کہ مرد کہتا تھا کہ گھر آ ہی رہا ہے اور عورت کہتی تھی کہ گھر کہاں آ رہا ہے۔

اتنے میں مرد جیب سے ایک سکہ نکال کر پانی والے کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر وہ مڑ کر عورت سے پوچھتا ہے۔ " تم بھی پیوگی "۔

عورت کہتی ہے 'پھر تم نے یہ چکر شروع کیا۔ کتنی ہی بار کہا کہ مشین کا پانی نہ پیا کرو، گلا خراب ہو جائے گا، سانس پھولنے لگے گی اور رات بھر کھوں کھوں کرو گے "۔

'اب تمہاری طرح میں آلسی تو ہوں نہیں '۔

اس پر عورت برا سا منہ بناتی ہے۔ کڑوا کسیلا سا۔

پر وہ چلتے ہی رہتے ہیں۔ اس عرصے میں مرد کا چہرہ کچھ اور سیاہ ہو گیا ہے۔ عورت کے چہرے پر بھی سیاہ سائے رینگ گئے ہیں۔ ان پر کافی اضمحلال طاری ہے۔

بسیں، کاریں، ٹیکسیاں، اسکوٹریں کبھی ان کے سامنے آتی ہیں اور کبھی ان کی پشت سے نکل کر ان کا منھ چڑاتی ہوئی آن کی آن میں منزلوں دور نکل جاتی ہیں۔

ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ عورت مرد کا منھ دیکھتی ہے اور مرد عورت کا' تب دونوں کے چہروں پر تکانیوں کا دفتر گرم ہو جاتا ہے۔

'تمہاری جیب میں گھر کا پتہ ہے۔'

'میں پتہ بھولا نہیں ہوں، ہمت رکھو، دراصل تم چلنے میں بہت کچی ہو۔'

'جانتے تم ہو جب میں اس شہر میں نیا نیا آیا تھا تو ایک بچے نے مجھ سے کہا تھا۔ "انکل یہاں گیارہ نمبر کی سروس بہت اچھی ہے، وہ کبھی نہیں چھوٹتی۔'

عورت نے سوال کیا 'گیارہ نمبر کی سروس؟'

مرد نے اپنی دونوں ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس پر عورت کو یوں لگا کہ کوئی اس کے پیٹ میں گدگدیاں کر رہا ہے اور وہ دیر تک پیٹ پکڑ کر ہنستی رہی، مرد بھی اس کا ساتھ دیتا رہا۔

'گیارہ نمبر کی سروس'۔

مرد نے کہا۔ 'سوچو اگر یہ لطیفے نہ ہوتے تو ۔۔ جینا دو بھر ہو جاتا'۔

لیکن دیر تک ہنسنے کے بعد پھر ان پر بے کیفی سی طاری ہو گئی، جیسے ہوا کے سبھی ٹھنڈے جھونکے نکل چکے ہوں اور اب سموم ہے اور وہ ہیں۔

وہ بدمزہ بدمزہ سے چلتے رہے۔ گرم گرم ہوائیں ان کے چہرے کو جھلسا دیتیں اور ریت کے ذرے نئی پرت ان پر جم جاتیں، وہ اسے رومال میں سمیٹ لیتے۔

کچھ دیر تک وہ اسی عالم میں چلتے رہے۔ لیکن شاید اپنے اندر سمٹ جانے سے راہ اور بھی کٹھن ہو جاتی ہے، اسی لئے عورت اس خاموشی سے اوب گئی۔

'ادھر کئی دنوں سے میرے گھٹنے میں سخت تکلیف رہنے لگی ہے۔'

'وہ گولیاں بند کر دی ہوں گی، کتنی ہی بار کہا۔'

'گولیاں دو چار دن کام آتی ہیں، اس کے بعد عادت بن جاتی ہے۔'

'میں دراصل آرام کرنے کے لئے بنائی گئی ہوں۔ مگر تم تو سدا سے میرے دشمن ہو۔ ایسی راہوں پر لے چلتے ہو جن کا کوئی اور چھور ہی نہیں ملتا۔'

"چلنا زندگی ہے۔" مرد اس گفتگو کو دوسرا رخ دینا چاہتا ہے۔

پھر وہ کچھ دیر تک خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔

'سڑک تو کہاں ختم ہوتی ہے'۔

'تیز تیز آنے والی سواریو، تم کب ٹھہرتی ہو' کہاں ٹھہرتی ہو'۔

'دوکانیں، بینک، عمارتیں — تم سب کس کے لئے ہو'۔

ان کی آنکھیں استفسار کرتی رہیں۔ پریشان حال سی ادھر ادھر بھٹکتی رہیں۔

'وہ مکان کیا فراڈ ہے'۔

'نہ ہی تو'۔ مرد نے ایک ایک حرف پر زور دیتے ہوئے کہا۔

'آخر کب سے چل رہے ہیں'۔

اور یہ تم کسے دیکھ رہے ہو۔

تب ہی مرد کی خوش طبعی ایک لمحے کے لئے لوٹ آئی۔

سرخ، زرد اور سیاہ — یہ سبھی رنگ جو چھلک رہے ہیں۔

اور تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔

کیوں — میں تو مجبور ہوں، میں اپنی راہ پر چلتا رہتا ہوں کہ ایک خوبرو نوجوان میری پشت پر آکر کہتا ہے 'وہ سامنے دیکھئے'۔ میں اسے دیکھتا ہوں، کبھی اپنی نظر سے کبھی اس کی نظر سے کہ اتنے ہی میں ایک اور نوجوان اس کی پشت پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور دریافت کرتا ہے۔ 'آپ نے یہ چمکتے رنگ دیکھے'۔

مجھے تو ہر لمحہ یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی میرے پیچھے چل رہے ہیں جو مجھے نظر نہیں آتے۔

لیکن جو سامنے نہیں آتے ان کی ذمہ داریاں تم پر کس طرح عائد ہوتی ہیں۔

بحث کچھ گرم ہو جاتی ہے کہ مرد جیسے آخری باب پر پہنچنے کی کوشش میں کہتا ہے۔

'تم نے تو چلتے ہی وقت کہہ دیا تھا کہ میں تمہارا مرکز ہوں'۔

اس پر عورت اسے ایسی نظر سے دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ میں تو سدا اپنے قول پر صادق رہی ہوں'۔

اور ان کی راہ کہ جس پر کچی مٹی کی دبیز تہیں تھیں حد نظر تک جاری تھی۔

'آخر یہ مکان والا چکر کب ختم ہوگا۔ تم بھی بات کیوں نہیں بتاتے'۔

نہ سورج سوا نیزے پر آ کھڑا ہوا ہے، نہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑ رہے ہیں اور نہ چاروں اُور "العطش" "الجوع" کی سر برہنہ چیخیں بلند ہو رہی ہیں مگر تم ہو کہ صبر کا دامن چھوڑتی جا رہی ہو ـــ

بس وہ مکان آ ہی چلا ــ

اس کڑی دھوپ نے ان کے چہروں پر سیاہ خیمے نصب کر دیئے ہیں۔ کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی سڑک پر نہ رکنے والی بھیڑ میں اٹی ہوئی بسیں ہیں۔ بھر کاریں ہیں، ٹیکسیاں ہیں، آٹو رکشائیں ہیں، اسکوٹریں ہیں ـــ عمارتیں، دفاتر، بینک، پٹرول پمپ۔ ہر دو جانب یہ مناظر دور تک بکھرے ہیں۔

اور اس عالم میں وہ اپنی راہ پر چل رہے ہیں لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عورت دو چار قدموں کے بعد تھک کر گر جائے گی ـــ اور مرد بھی تھکن کی تاب نہ لا کر کسی لمحے گر سکتا ہے ـــ

۱۹۷۴ء

—— ◆ ——

اونچی اونچی عمارتیں

میرے ہاتھ میں ایک بھاری سا چرمی بیگ ہے، جس کے متعلق میرا دل کہتا ہے کہ یہ بیگ نہیں ہے، کئی ایک کیفیتوں کی قیام گاہ، کئی ایک تہذیبوں کا وطن اور کئی ایک قبیلوں کا دیار ہے، جو آپس میں دست و گریباں ہیں۔

مثلاً یہ کہ فارم ہیں جو امیدوں کی لہلہاتی فصل کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرسبز و شاداب ہیں۔ تمناؤں میں الجھے ہوئے خطوط ہیں۔ ایک بال پن ہے کہ جیب کے قلم کا کیا بھروسہ، کہاں اس کا نب خشک ہو جائے، کہاں وہ سرشت دنیا کو یک قلم خیرباد کہہ کر کسی دوسرے کی جیب یا کھوے سے کھوا چھلتی ہوئی سڑک پر نظر آئے۔ ہرے رنگ کی ایک ٹیوب میں کریم ہے کہ یہاں اکثر ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں اور ناک خشک ہو جاتی ہے۔ پالیتھین کے ایک چھوٹے سے پیکٹ میں سر کے درد کی گولیاں ہیں۔ ایک چھوٹی تولیہ ہے۔ دو چار کھلے لفافے ہیں اور ایک لنچ بکس ہے۔

یہ کیفیتیں، یہ تہذیبیں اور یہ قبیلے میرے اپنے ہیں اور میں تنہا فرد ہوں جو ان سے کما حقہٗ واقف ہوں۔ بسوں کا یہ عالم ہے کہ ان کے اندر داخل ہونے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیے اور پھر باہر نکلنے کے لئے

بھی سر دھڑ کی بازی لگائیے، اور ہر بار ان کے اندر داخل ہونے اور ان سے باہر نکلنے پر اطمینان کی سانس کو زینہ بہ زینہ اپنے اندر اُتاریے اور خدا کے حضور میں ان لبوں سے جو حمد کے خوگر ہیں، یہ شکوہ کیجیے کہ اس کی امانت جو جانِ عزیز کی صورت میں ہمارے پاس ہے اسے بچانے کے لئے کیا کیا نہ صدمے اٹھانے پڑتے ہیں، اور اگر اس کی امانت نہ ہوتی تو ہم کب کے یہ فیصلہ کر چکے ہوتے کہ جائے تو جائے ہیں اس سے کیا لینا دینا۔

چنانچہ بس سے جان و دل صحیح سالم نکال لانے کے بعد میں نے اردگرد کا ایک جائزہ لیا تو میرے سامنے ایک وسیع و عریض فٹ پاتھ تھا، جس پر ان گنت دنیائیں اور ان گنت دنیا کے جلوے آباد تھے۔

کتابوں کا تاجر ہے جس نے یہاں سے وہاں تک کتابیں سجا رکھی ہیں، یہ کتابیں وہ ہیں جو کئی کئی بار پڑھی جا چکی ہیں، جن کا آپس میں کوئی گہرا رشتہ نہیں ہے، عہد مختلف ہیں، مزاج مختلف ہیں مگر وہ یہاں بلا وجہ نہیں رکھی گئی ہیں، کیونکہ اس بازار میں ان کے بھی رسیا مل جاتے ہیں جو انہیں اپنے گھر لے جاکر، ایڈی کلون میں نہلا کر، نئے زمانے کے ملبوس پہنا کر، چہرے پر تازہ سُرخی اور تازہ روغن لگا کر نئی کتابوں کے بازار میں لے آتے ہیں۔

آگے رومال اور بچوں کی جانگیہ بیچنے والا چیخ چیخ کر اپنے سستے مال کی تشہیر کرتا جا رہا ہے۔

دری بچھائے ایک صاحب ہتھیلیوں کا نقش لئے بیٹھے ہیں۔ آٹھ آنے لے کر بے کم و کاست سارا حال بتا دیتے ہیں اور مستقبل میں روشنی کا یوں ذکر کرتے ہیں کہ گاہک جھوم اٹھتا ہے اور حساب چکتا کر کے خوش خوش چل دیتا ہے۔

آگے کوئی طشتریوں میں چھلی ہوئی گاجر اور ٹماٹر کا سلاد بیچ رہا ہے، چار آنے کی ایک طشتری —— اور دھوپ چونکہ سخت ہے اور ہر چیز آن کی آن میں سوکھ جاتی ہے۔ اس لئے دکاندار نے ایک بالٹی پانی بھی وہیں رکھ چھوڑا ہے۔ ادھر سلاد خشک ہوا اور اُدھر اس نے پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔

ایک ٹوکری میں کیلے بھرے ہیں، پچیس پیسے میں ایک، تیز چھری کیلے کے تن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان میں پسی ہوئی سیاہ مرچ چھڑک دیتی ہے۔

وہیں پر ایک موچی بھی بیٹھا ہے۔ موچی جانتا ہے کہ جوتا کھلنے، تلوے گھسنے، لیس ٹوٹنے اور جوتے کے بدرنگ ہونے کا مرض اس شہر میں عام ہے۔ اس لئے آپ نے فقط ایک لفظ "ہیل" کہا، اس نے اجرت بتائی اور سب کچھ فٹافٹ، فٹافٹ دراصل ایک منتر ہے، جس کے پڑھتے ہی گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔

پاس ہی ایک ٹھیلے والا گنے کا رس بیچ رہا ہے۔ ایک طرف چھلے چھلائے گنے ڈالے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کا رس نکلتا ہے۔ گلاس کے دو سائز ہیں ٹھیلے والا حسب فرمائش گلاس بھر کر۔ برف ڈالتا ہے اور پھر دوسرے گاہک سے رجوع کرتا ہے۔

ایک اور بھی کنارے کھڑا ہے جو مشین کا ٹھنڈا پانی پانچ پیسے گلاس بیچتا ہے۔ سکہ پھینکا گیا۔ اس نے اسے اٹھایا اور دوسری ساعت سٹوں سٹوں کرتا ہوا پانی گلاس میں آگیا۔

یہ الگ الگ مسائل، الگ الگ رنج و غم والے افراد ہیں جو خدا کی اس بستی میں رزق حاصل کر رہے ہیں کہ یہاں رزق کسی کو فرش پر ملتا ہے اور کسی کو عرش پر ـــــ

یہ کارخانہ گرم ہے۔ میں دیکھتا بھالتا ہوا، دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس انداز سے کہ گمان ہو کہ یہ شخص چل نہیں رہا ہے مشاہدہ کر رہا ہے، اس عمارت کی طرف بڑھتا ہوں جہاں ساتویں منزل پر مجھے ایک کام ہے ویسے آپ سے کیا پردہ مجھے کوئی کام وام نہیں ہے، کیونکہ جن صاحب سے مجھے ملنا ہے وہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں جن سے میں وقتاً فوقتاً ملتا رہتا ہوں ـــــ اسی طرح کی اونچی عمارتوں میں بسنے والے لوگ۔ اور جواب ہر جگہ ایک ہی ملتا ہے۔ "ابھی کچھ اور انتظار کرو۔"

اس انتظار میں بہت سے دن، بہت سے ہفتے، بہت سے مہینے نکل گئے۔ سچ پوچھئے تو وقت گذرنے کا مجھے کوئی غم نہیں، کیونکہ وقت تو آتا ہی ہے گذر جانے کے لیے۔ وہ اگر میرے پاس رہ بھی جاتا تو میرا کیا بھلا ہوتا، پر یہ کہ وہ اپنے ساتھ میری کچھ رقم بھی لے گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے اب اس رقم کے ضائع ہونے کا غم ہے۔ کیونکہ ان عمارتوں سے ملنے کے لیے، جو آسمان سے ہمکلام ہیں کچھ تو رقم ہونی ہی چاہیے....

.... ورنہ یہ کہ کوڑی نہیں ہے پاس تو کوڑی کے تین ہو ـــــ

ساتویں منزل تک جانے کے لیے مجھے لفٹ کی مدد لینی پڑتی ہے اور اگر لفٹ خراب رہی تو ساتویں منزل تک پہنچتے پہنچتے کئی قیامتیں گذر جاتی ہیں۔ اور منزل پر پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے کھڑے ہیں، ایک ان میں سے بری طرح ہانپ رہا ہے اور دوسرا کھڑا اسے سخت پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کرتا جا رہا ہے کہ اگر بولے تو پھیپھڑا پھٹ کر غبارے کی طرح بجھ جائے گا۔ پھر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ مشورے کرتا ہے اور تب وہ مل کر سانس کی باگ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے

ہیں، اور پھر ایک ہو کر چل کھڑے ہوتے ہیں۔

برآمدے سے راہداری۔ یہ راہداری ایک اور راہداری کا رُخ کرتی ہے جو ایک بڑے ہال پر ختم ہوتی ہے۔ جہاں مشین کے چھوٹے چھوٹے پرزے تیزی سے چل رہے ہیں، بڑی مشین کو حرکت میں لانے کے لئے۔ بڑی مشینوں کے کمرے کے اوپر تختیاں لگی ہیں۔ باہر ایک پاسبان بیٹھا ہے۔ "صاحب میٹنگ میں گئے ہیں ۲ بجے تک آئیں گے۔ اُدھر بیٹھ جاؤ۔"

میں ایک میز کے کنارے لگی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ میز فائلوں سے لدی پھندی ہے۔

ابھی صرف دن کے گیارہ بجے ہیں۔

جس کی کرسی ہے وہ غائب ہے مگر اس کا چھوٹا سا تھیلا فائلوں کے اوپر رکھا ہے۔

اب بجز انتظار کے مجھے کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آپ اژدہام سے بچ کر نکل آئیں تو تنہائی اس سے بھی بڑا اژدہام کھینچ لاتی ہے۔

یہ مشین کی کھٹ کھٹ۔ دفتر کی بھنبھناہٹ کا ہیولیٰ، یہ فرش، یہ چھت، یہ پنکھے۔ یہ پھیلے ہوئے شیشے جن کے قدموں تلے شب و روز تماشہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب مجھ سے محوِ کلام ہیں۔ اور یہ وہ باتیں ہیں جو ارضی ہونے کے باوصف ارضی نہیں ہیں کہ ان میں جھوٹ نہیں ہے، ریا نہیں ہے، تفس نہیں ہے۔

تب ہی وہ صدر کی کرسی والا پہنچ جاتا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے اور میں اُسے دیکھتا ہوں اور اس کے بعد ہم اس طرح اپنی نظریں پھیر لیتے ہیں جیسے ہمیں تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ فائلوں پر جھک کر کام کرنے کے باوجود ایک اضطرابی کیفیت میں بار بار پہلو بدلتا ہے، بار بار دزدیدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتا جاتا ہے۔ میں اس کا یہ اضطراب بھانپ لیتا ہوں اور اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

ابھی، افسر کے آنے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔ انتظار تو جیسے میرا مقدر ہے۔

ایک لفٹ ہے جو ساتویں منزل سے چودھویں منزل کا سفر کرتی ہے۔ میں بیچ کی سبھی منزلوں کو چھوڑتا ہوا چودھویں منزل پر پہنچتا ہوں۔ وہی ایک نقشہ جو نیچے کے دفتر کا ہے۔ کونسا دفتر ہے؟ اب کون یہ دیکھے اور کون چھان بین کرے

مجھے تو وقت کے خزانے کو بے دریغ لٹانا ہے۔

برآمدے میں یہاں سے وہاں تک شیشے کی دیوار کھڑی ہے۔ میں نے سوچا نیچے کا منظر دیکھوں۔
بلندیوں پر پہنچ کر سب کچھ سبز رنگ میں مدغم ہو گیا تھا۔

کئی کمرے، باتھ اور یورینل کا جہاں ۔ ہر دو تین منزل کے بعد ایک کینٹین ۔ بیوی ہوتی تو کہتی
"آپ کے شوق کی ساری چیزیں یہاں موجود ہیں"۔

کمروں کے کئی چکر کاٹ کر پھر برآمدے میں اسی شیشے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اس میں ارادے
کو کوئی دخل نہیں کہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ وقت کا بے پایاں سمندر میرے ساتھ ٹھاٹھیں مار رہا ہے،
اور میں اس میں سے چلو بھر بھر کے پانی نکال رہا ہوں اور اسے دوسری سمت پھینک رہا ہوں۔ مقام حیرت
ہے کہ نہ سمندر کا پانی ایک بوند کم ہوتا ہے نہ میں ہی تھکتا ہوں۔

تب ہی میں نے سوچا کہ اس منظر کو کہ یہاں سے وہاں تک سبزہ اگا ہے اور ناکارہ گائیں گھاس
چر رہی ہیں، درمیان میں ایک گندے پانی کا نالہ بہہ رہا ہے۔ پھر درختوں کا ایک حصار ہے جس سے پرے
فلک بوس عمارتوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے، نیچے والی منزل اور اس سے بھی نیچے والی منزل
پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسری ہی ساعت مجھے یہ احساس ہوا کہ میں زینے طے کرتا ہوا نیچے والی منزل پر جا رہا ہوں، بہت
ہی آہستہ آہستہ ۔۔ موزیک کے اس فرش پر ہزار جانیں کیا خاک ہونگی، لیکن میرا ارادہ کچھ ایسا ہے کہ
وقت کو روند بھی ڈالوں گا اور وقت کی جان بھی بخش دوں گا۔

اچانک ایک عجیب سی کیفیت نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جلال و جمال کا پیکر بنا میں ایک
ملکوتی شان سے، ایک ایک صدی میں ایک ایک زینے کو طے کرتا ہوا نیچے کی منزل کی طرف جا رہا ہوں، اور
میرے مریدوں اور عقیدتمندوں کا ایک جلوس میرے آگے الٹے قدموں سے اترتا ہوا ہر زینے پر طلائی پھریریں
بچھاتا جاتا ہے، جنہیں میری پشت پر چلتا ہوا ایک مرید اپنی جھولی میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح یہ سفر چودھویں
منزل سے شروع ہو کر بیسمنٹ پر ختم ہوتا ہے اور تب میرا مرید مجھے خبر دیتا ہے کہ اس جہل خانہ گنج کے بوجھ
سے اس کے کاندھے ٹوٹ رہے ہیں اور اب وہ اس سے آگے ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔

لیکن میرے پاس تو صرف وقت کا خزانہ ہے جسے میں اس شہر میں (جہاں وقت کا کال پڑا ہے)

بلا خوف و خطر دونوں ہاتھوں سے لُٹا رہا ہوں۔

تیرھویں منزل کے زینے نے بارھویں منزل کو پہنچایا۔ وہی سارے کمرے، وہی باتھ، وہی پورٹیبل، وہی شیشے کی دیوار کے سائے میں ایک منظر۔ لیکن دھیرے دھیرے اس کے چیمبر واضح اور واضح ہوتے جاتے تھے۔

گیارھویں منزل دسویں منزل کی راہ دکھاتی تھی اور دسویں نویں کی۔ نیچے آتے ہوئے کبھی میں آگے کو دیکھتا ہوں جہاں گہریں نچھاور کرنے والے مرحبا، اہلاً و سہلاً کہتے چل رہے تھے اور کبھی پیچھے کی طرف دیکھ لیتا کہ ادھر پتھر پھینکنے والے تاد رہے تھے۔ اور خوش تھا کہ بیسمنٹ تک پہنچتے پہنچتے ایک چہل خانہ گنج کی کلید میرے قبضے میں ہوگی۔

میں نے گھڑی دیکھی، ایک بے حد معروف انسان کے انداز میں۔ ابھی لنچ کو آدھ گھنٹے اور باقی ہیں۔ مجھے پہلی منزل کی کینٹین میں لنچ لینا ہے، اور ابھی میں ساتویں منزل پر ہوں اور باری باری مجھے سبھی منزلیں طے کرنی ہیں، اور جب میں منزلیں طے کرنے کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس عمارت کی منزلیں نہیں ہیں بلکہ وقت کی منزلیں ہیں۔

ساتویں منزل پر شیشے کی دیوار پر کھڑے کھڑے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا نیچے کی طرف چھلانگ لگا رہی ہے۔ تب ہی میرے دل میں ایک خیال آیا کہ کاش وہ طلسمی 'قبا' میرے پاس ہوتی جسے زیب تن کرنے پر میں سب کو دیکھتا مگر مجھے کوئی نہیں دیکھ پاتا اور پھر روئے زمین کے سارے خزانے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتے، اور تب وہ چہل خانہ گنج کی کلید واقعی میرے قبضے میں ہوتی۔

لیکن ساتویں منزل پر تو ایک طلسمی آنکھ راج سنگھاسن پر بیٹھی تھی جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ جب تک وہ بھول نہ برسائے نجات کی راہیں کسی طور سے کھل ہی نہیں سکتی ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ہر عمارت کی کسی نہ کسی منزل پر ایسی ہی کوئی آنکھ ضرور راج کرتی تھی۔

اب دس منٹ اور رہتے۔ بس کوئی دم میں کینٹین میں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں بیسن میں منھ ہاتھ دھو کر بیرے کو ایک کپ چائے کا آرڈر دوں گا، اور تب لنچ بکس کھول کر لنچ حلال کر لوں گا۔ اس نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے کے سفر میں ہر لحظہ ہی محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنے اوپر روٹیاں حلال کر رہا ہوں۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ

ساتویں منزل پر بسنے والی طلسمی آنکھ پھول برسائے یا نہ برسائے، کوئی کہاں تک اس کی فکر کرے کہ ہماری خود مختاری تو بقول کسے ہم پر محض ایک تہمت ہے۔

لنچ خشک ہو چکا ہے۔ بار بار یہ جی چاہتا ہے کہ روٹیوں کے لئے کوئی سبزی لے لی جائے۔ کئی بار میں چپکے چپکے بجٹ کی کتر بیونت کرتا ہوں لیکن سبزی کسی طرح اس میں فٹ ہی نہیں ہوتی، کیونکہ اس کے بعد ایک چائے کا بھی مد تھا۔ دو روپے کی چادر میں کوئی کہاں تک پاؤں پھیلا سکتا ہے۔ ویسے راز کی بات یہ ہے کہ آج پورا ایک روپیہ بچ رہا تھا ایک خاص کام کے لئے۔

اب دو بجے ہیں۔ میں سوچتا ہوں ایک بار پھر ساتویں منزل تک کا سفر کیا جائے۔ بیسمنٹ میں پہنچ کر میں نے سوچا۔ لفٹ وہ استعمال کرے جس کے پاس وقت کی کمی ہو۔ میں تو دیر سے اس خزانے کو لٹا رہا ہوں اور خزانہ بھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا ہے۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا، ہر منزل پر رک کر نیچے کی ایک ٹھہری ہوئی دنیا کا نظارہ کرتے ہوئے میں آدھ گھنٹے میں ساتوں منزلیں طے کر لیتا ہوں۔

اب شاید وہ آ گئے ہوں جن کی میں راہ دیکھ رہا ہوں، حالانکہ کیا خاک میں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں، مجھے تو پانچ بجے تک کے اس دن کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔

صاحب نہیں آئے ہیں۔ میں نے اوپر کی کچھ اور منزلیں سر کر لیں۔

صاحب نہیں آئے ہیں۔ کیوں، تین تو بج گئے۔ (قیامت تک نہ آئیں مجھے کیا، میرا پانچ کا وقت تو آ ہی جائے گا)۔

تیسری بار میں صاحب آ گئے۔

چہرے کی مسکراہٹ تو دراصل خباثت کا بہت بڑا روپ ہے۔

"جی میں ضرور انتظار کروں گا۔"

تب ہی میرے دل نے کہا۔ "تو بھی تو بڑا خبیث ہے، تجھے تو معلوم تھا کہ یہی جواب ملے گا۔"

میں نے اسے کہا۔ "اے بندۂ خدا اول تو دفتر کے کچھ اوقات ہوتے ہیں۔ عموماً دس سے پانچ تک۔ میں نے تو یہ اوقات دفتر میں گزارے۔ پھر ہمارا ایک محتسب ہوتا ہے جو ہمارے اندر ہی کہیں چھپ کر بیٹھا

رہتا ہے۔ وہ حق، ناحق۔ حلال و حرام، عمل و بے عملی کی باتیں کرتا رہتا ہے، وہ بھی اس زینہ پیمائی سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

دیکھو مجھے دو تین وقت کی روٹیاں ایک جگہ سے مل جاتی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے لئے دو روپلیاں میں اپنی پونجی میں سے ہر روز نکال لیتا ہوں۔ میں نے چونکہ کوئی علت نہیں پالی ہے اس لئے ان دو روپیوں میں مزے سے گذارہ ہو جاتا ہے۔ بس کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ نفس کافی کی طرف دوڑ پڑتا ہے یا کبھی سنترے کے بھرے گلاس کی طرف تکنے لگتا ہے، اور سوچنے کہ جس کی کل پونجی دو روپے ہے۔ وہ کیا کرے۔

لیکن آج سویرے سے میرا یہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک لاکھ کا نقصان اٹھاؤں۔ یہی تو اس میں رمز ہے کہ پاس میں صرف ایک روپیہ ہو اور اس پر آدمی ایک لاکھ کا نقصان اٹھائے۔

قصہ یہ ہے کہ میرا ایک دوست ہے جو پابندی سے ماہ بہ ماہ ہر ریاست کی لاٹری کی ٹکٹ خریدتا ہے۔ اور ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں وہ چالیس پچاس لاکھ کا خسارہ اٹھانے کے غم میں ایک تقریب بپا کرتا ہے۔

ایک لاکھ + ایک لاکھ + پانچ لاکھ ...... اسی طرح یہ رقم چالیس پچاس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے

ہم اس کے غم میں اس کا ساتھ دیتے ہیں، چائے پیتے ہیں، گرم گرم سموسے کھاتے ہیں اور پھر بھیگی ہوئی عینکوں کو صاف کرتے ہوئے اس سے رخصت ہو بیٹھتے ہیں۔

سو میں نے بھی ایک لاکھ کے خسارے کی ٹھانی ہے۔ آج کا حساب تو برابر ہی ہو جائے گا۔

اب چار بج چکے ہیں۔

ابھی ایک گھنٹہ اور باقی ہے۔ میں فٹ پاتھ پر آکر نیچے سے اوپر تک اس عمارت کو دیکھتا ہوں اور دل کے صفحے پر جلدی جلدی ایک حساب کر لیتا ہوں ــــ چودھویں منزل تک شاہانہ چال سے چلنا اور پھر اسی شاہانہ چال سے لوٹنا۔ یقینی یہ ایک گھنٹہ بسر ہو جائے گا۔

چنانچہ بیسمنٹ سے میرا سفر شروع ہوا، پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی تا آنکہ چودھویں منزل ــ باتھ روم میں آئینے لگے تھے۔ میں نے سوال کیا ''اب چلا جائے؟''

جواب ملا ''اور کیا''۔

میں زینہ بہ زینہ اتر رہا ہوں۔ آگے آگے عقیدتیں طلائی لہریں بچھا رہی ہیں، پیچھے ایک مرید

اسے سمیٹ رہا ہے۔ بیسمنٹ ایک جہل خانہ گنج کی کلید میرے سپرد کردے گا۔

یہ شاید ان ہی زینوں پر چپکے سے کوئی طلسمی قبا میرے حوالے کردے گا اور پھر وہی جہل خانہ گنج۔

مگر بیسمنٹ تک پہنچ کر معلوم ہوا کہ جیب میں صرف ایک لاکھ کا خسارہ پڑا تھا۔۔۔

اگلی ساعت پانچ کی تھی۔

آج کی تو چھٹی ہوئی کل کیا ہوگا۔۔۔

مگر ان اونچی عمارتوں والے شہر میں تو یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے، اور ابھی تو میرے بیگ میں کتنے ہی نامۂ شوق اور بھی پڑے ہیں۔

۱۹۷۵ء

——— ٭ ———
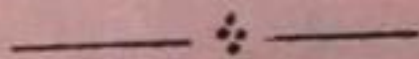
ایک منظر سامنے کا

ایک شخص ستون سے بندھا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ ماتھے پر ایک مضبوط کپڑے کی پٹی ستون سے اس کے رشتہ کو مزید قوت پہنچا رہی ہے۔ گردن میں ایک قدرے ڈھیلی رسی بندھی ہے۔ منھ میں ایک کپڑا ٹھونس کر اسے سختی سے بند کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ یہ شخص اگر ہاتھ اٹھانا چاہے تو ہاتھ جنبش نہیں کر سکتے۔ پاؤں چلانا چاہے تو یوں محسوس ہو کہ وہ سوں مٹی میں دھنس چکے ہیں۔ گردن ہلانا چاہے تو جیسے کہ گردن پر آرے چل رہے ہیں۔ سر گھمانا چاہے تو یہ لگے کہ سر پر میخیں جڑ دی گئی ہیں اور بولنا چاہے تو ایسا گمان ہو کہ گویائی کے دروازے پر ہزاروں قفل لگا دیے گئے ہیں۔

اب یہاں ایک ستون ہے اینٹ اور گارے کا اور ایک ستون ہے گوشت و پوست کا، جس کی کئی حسیں اب بھی آزاد ہیں جیسے وہ دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، سوچ سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ اور حسوں کے مٹنے کے بعد ہی انسانی عمل وجود میں آتا ہے۔

فی الوقت تو عالم یہ ہے کہ وہ اس طرح رسیوں میں جکڑا ہے کہ بے قوت ہے، بے زبان ہے اور اسکے

چاروں اُور خلقت کا اژدہام ہے اور وہ جس کے ہاتھ میں کوڑا ہے اس پر قیامتیں برسا رہا ہے۔

سڑاپ — سڑاپ — سڑاپ

ایک سانپ جو برس رہا ہے ایک سانپ جس نے خلقت کو ڈس لیا ہے۔

سڑاپ — سڑاپ — سڑاپ

تم کیا جانو اس کمبخت کو۔ ایک دن میری بیوی کھانا پکا رہی تھی۔ یہ وہاں پہنچ گیا۔ بیوی کہتی ہے اس کے چہرے پر خشونت تھی، درندگی تھی اور ایسا طنز تھا جو سید عادل پر وار کرتا ہے۔

وہاں پہنچ کر جانتے ہو اس نے میری بیوی سے کیا کہا۔ سنو گے ؟۔

ایک طویل خاموشی ایک طویل 'ہاں' بن گئی —

اِس بدبخت نے اس سے کہا — 'جس کے ہاتھ میں کفگیر ہو اسے دیگیر بھی ہونا چاہیے'۔

سڑاپ — سڑاپ — سڑاپ

وہ سب دھڑکتے دلوں سے سوچ رہے تھے کہ اس سراسیمگی کے عالم میں اگر اس کی آنکھیں برہنہ پا باہر نکل آئیں تو کیا ہوگا —

اور سنو بھائیو — یہ ذلیل اوقات بیشتر مجھ سے یہ کہا کرتا کہ دس ہمیشہ ایک سے بڑا ہوتا ہے۔ میں اسے سمجھاتا کہ ایک اور ایک اور ایک اور ایک — تا آنکہ یہ دس ہوتے ہیں۔ اس لئے بنیادی اہمیت ایک کی ہے اور بڑا وہ ہے جو بنیادی اہمیت رکھتا ہو۔ یہ بات کبھی بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ایک اور ایک اور ایک کو ہمیشہ 'ایک' کے خلاف اکساتا رہا۔

سڑاپ — سڑاپ — سڑاپ

خلقت سہم گئی کہ کہیں اس کے چیتھڑے نہ بکھر جائیں کہ وہ ستون تو اینٹ اور گارے پر کھڑا ہے مگر اس ستون کے جسم میں تو گرم لہو کا چشمہ رواں ہے اور یہاں سے وہاں تک تازہ مچھلیاں مچل رہی ہیں۔

سڑاپ — سڑاپ — سڑاپ

لوگ سختی سے آنکھیں میچ لیتے ہیں اور پوری طاقت کے ساتھ اپنی آواز کو اپنے حلقوم میں اسیر کر لیتے ہیں کہ کسی کی ایک 'آہ' یا ایک 'کراہ' پھنکارتے ہوئے کالے کو متوجہ کرنے کے لئے کافی تھی —

اور سنو۔ مجھ سے کہتا کہ تم 'ساز' اور 'باز' کے فرق کو سمجھو۔ دیکھو یہ جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے جب ساز اٹھاتا ہے تو آسمان تک وجد میں آجاتا ہے اور ایک تم ہو محض چیخ ——— محض جھپٹ ———

میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ پڑوسی لئیم اس کا کون ہے۔ بھائیو تم ہی بتاؤ کون ہے اس کا؟

شڑاپ — شڑاپ — شڑاپ

کانپتے ہوئے لوگ سوچ رہے تھے کہ کہیں مقید اور آزاد جسموں کی راہ سے ہوتی ہوئی اس کی روح نہ باہر نکل آئے اور ہم میں سے ایک ایک سے یہ پوچھے کہ 'ہم نفسو تمہاری روحیں کدھر گئیں؟ پھر ہم اسے کیا جواب دیں گے ———؟

شڑاپ — شڑاپ — شڑاپ

اور جانتے ہو اس نابنجار کے ظلم کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔

سنو یہ کتنی بھیانک کہانی ہے۔ اس نے میرے بچوں کو بہکا دیا کہ اگر تمہارا باپ کہے کہ روشنی گل کر دو تو کبھی اس کی بات نہ ماننا کہ آخر پروانوں کو بھی تو جینے کا حق حاصل ہے۔ اسے تو انسانی آبادی کا سکھ چین سرے سے پسند نہیں تھا۔ پروانے اگر سارے میں گشت لگاتے رہیں تو تم ہی بتاؤ کہ کیا کوئی آرام سے سو سکتا ہے۔

شڑاپ — شڑاپ — شڑاپ

لوگ سوچنے لگے کہ یہ تو پتہ نہیں کہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے اسے تو شاید کچھ نہ ہو لیکن ڈر ہے کہ کہیں وہ پھنکارتا ہوا، برستا ہوا، ڈستا ہوا سانپ دم نہ توڑ دے۔ تو پھر اس شخص کے ہاتھ میں کیا رہ جائے گا۔

ان کی آنکھیں کچھ کھلی تھیں کچھ بند تھیں۔ ان کے ہوش کچھ باقی تھے کچھ اڑ چکے تھے، کچھ پتھر بن چکے تھے، کچھ پتھر بننے کے عمل میں تھے کہ ایک عجیب سے منظر نے انھیں تازہ دم کر دیا۔

ایک نوجوان مجمع سے نکل کر دس قدم پیچھے گیا وہ معمولی قمیص اور پاجامے میں ملبوس تھا اور اس کے پاؤں میں ربر سول کے جوتے تھے۔

دس قدم پیچھے ہٹ کر اس نے ایک زوردار ہانک لگائی۔

نامردو! یہ بھی سوچو کہ صرف اس ماں کے خصم کے ہاتھ کا پھنکارتا ہوا سانپ ہی کیوں بولتا ہے'

وہ کیوں نہیں بولتا جو رسیوں میں بحیثیت مجرم کھڑا ہے۔ اور جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے۔

رنگیلے اسے پکڑنا ——

مسیتے اس تخم حرام کی خبر لو ——

یہ سؤر کا بچہ یہاں کیسے آگیا ——

خلقت کی آنکھوں کے شہر روشن ہو گئے تھے مگر نوجوان بھاگتا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے رنگیلے، مسیتے اور جانے کون کون ——

۱۹۷۵ء

—— ⁂ ——

مطلع

وہ دو تھے جو آسمان کے اچانک ٹوٹ پڑنے پر ایک خوبصورت سے بند شوروم کے چھجے تلے آکھڑے ہوئے تھے۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اور وہ ایک ریستوراں سے نکل کر ایک خاص سمت میں چل دئے تھے، جہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ٹی اسٹال میں عمدہ دودھ کی چائے ملتی تھی۔ شہر میں دودھ کا کال تھا۔ اس لئے بیشتر جگہ لوگ لیموں کی چائے لینا ہر حال میں مفید سمجھتے تھے کہ پاؤڈر کے دودھ کی چائے پینے سے ایک ناگوار سی تلخی ان کے رگ و پے میں دوڑ جاتی تھی۔

شوروم بند ہے اس لئے اس کی روشنیاں بھی گل ہو چکی ہیں۔ دو شیشے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہیں۔ ان کے قدموں تلے موزیک کی سیڑھیاں ہیں اور ان کی دونوں جانب شوکیسیں شمشاد قداں، بتان طناز مقید ہیں۔ نئی سے نئی ڈیزائنوں کی ساڑیاں زیب تن کئے۔ ایک کے سر پر چھوٹی سی پہاڑی بجی ہے۔ اور دوسری کے رخسار پر ناگنیں رقص کر رہی ہیں۔

باہر بارش کا آہنگ تیز ہوتا جا رہا ہے۔ وہ بدمستی کے عالم میں ہوا کے دوش پہ جھوم رہی ہے۔ ہوائے

دور تک پچھم کی سمت لئے دوڑتی ہے، پھر مخالف سمت سے ہواؤں کا ایک نیا قافلہ آتا ہے۔ جو بارش کے تازہ دم قافلہ کو پورب کی طرف لے بھاگتا ہے ---- باہر سڑک کی روشنی میں بھی اس کھیل کو دیکھ رہے ہیں ---- اڑتی بھٹکتی اور خر مستیاں کرتی ہوائیں۔

اس سیڑھی پر اور بھی پانچ نفوس ان دونوں کے ساتھ چپکے کھڑے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سیڑھی پر تین افراد بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ایک کے پاس جلتی ہوئی گیس بتی ہے۔

ان سے فوٹ پاتھ کا فاصلہ کوئی چار فٹ کا ہے۔ ہوائیں تالیاں بجا کر مدہوش جھڑیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں ---- وہ انگلیاں اٹھا کر کہتی ہیں۔ "دیکھو وہ بھی تو ہیں" ---- اور تب ہی بارش کا ایک تیز سا تھپیڑا ہوا پر اڑتا ہوا آتا ہے۔ اور ان سے ایک بے حد نامعقول سا مذاق کرکے چلا جاتا ہے۔

ادھر آسمان پر ہر چند ساعت کے بعد بجلی دور تک ایک تیز دھار والا خط منحنی کھینچ دیتی ہے جس سے آسمان کا بھیانک جنگل یہاں سے وہاں تک روشن ہو جاتا ہے بعض ایک چھوٹی سی ساعت کے لئے یہ تیز روشنی کا جھماکا بے نقاب ہو کر پھر کہیں چھپ جاتا ہے۔ تب چند دفعوں کے بعد آسمان کا نقیب اسے گرجدار آواز میں پکارتا ہے ---- "تو کہاں گئی"

ہر بار یہی ہوتا ہے کہ جب وہ آسمان پر ایک ٹیڑھی میڑھی مانگ کاڑھ کر، اس پر افشاں چھڑک کر اور اپنے رخ روشن سے سارے میں اجالا کرکے کہیں گم ہو جاتی ہے تو کچھ دیر بعد یہ حضرت گرجتے برستے آنکلتے ہیں۔ اور آواز دیتے ہیں ---- "تو کہاں گئی"

اور وہ جو دو کھڑے دیر سے تماشا دیکھ رہے ہیں، انکی گفتگو کا بھی یہی موضوع ہے۔

"میں بھوک سے مر سکتا ہوں لیکن اس موسم کو برداشت نہیں کر سکتا"

دوسرے نے کہا۔ "جنگل میں ایک بڑھیا رہا کرتی تھی۔ ایک روز سخت بارش میں ایک شیر اس کی اوطی کے نیچے آکھڑا ہوا۔ جھونپڑی میں بڑھیا آپ ہی آپ بول رہی تھی ---- میں تو نہ ڈروں ناگ سے نہ ڈروں باگ سے۔ میں تو ڈروں جل راگ سے ---- شیر جو یہ سن کر بھاگا ہے تو اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا ---- شاید کہ جل راگ اس کا پیچھا کر رہا ہو"

جو یہ سنکر صرف مسکرا دیا اس کی عمر ابھی کچی ہے اور تجربے کے محل کے بہت سارے کمرے اس کے لئے ہنوز بند ہیں ——

اس کا ساتھی بیشتر کمروں کی حقیقت سے ناآشنا ہو چکا ہے' اس لئے وہ اس کی طرح سخت جھنجھلاہٹ کا شکار نہیں ——

'انسان معطل ہو جاتا ہے اس موسم میں لاحول ولا ......'

اتنے میں تھپیڑیاں بجاتا پانی کا ایک اور ریلا انہیں سر سے پاؤں تک بھگو جاتا ہے۔ نچلی سیڑھی پر جو گیس بتی لئے بیٹھا ہے' وہ اوپر کے زینے پر انکے برابر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس صف میں پانچ افراد پہلے ہی سے کھڑے تھے۔ اس لئے اب جگہ کی اور بھی تنگی ہو گئی ہے۔ پھر شیشے کی دیوار بھیگ جانے سے وہ کچھ بے سہارا بھی ہو گئے ہیں۔

تب ہی وہ دونوں شوکیسوں کی جانب دیکھتے ہیں' شاید انہیں یہ خیال آیا ہو کہ انہیں دستک دی جائے' مگر دقت یہ ہے کہ وہ دروازہ کھولتے ہی پوچھیں گی —— 'کہاں رہے اتنی رات ؟'

دروازہ کھولنے والیاں دراصل اسباب وعلل سے متعلق بے پروا ہوتی ہیں' اس لئے کون انہیں دستک دے ؟

مگر وہ جو شیشے کے گھروں میں آباد ہیں' ان کے متعلق ان کی سوچ کی ایک پرت اور بھی ہے۔

سڑک پر پانی بھر گیا ہے ایک سمت سے دوسری سمت جاتی ہوئی اسکوٹریں فوارے اڑاتی جاتی ہیں۔

سیڑھیوں پر کھڑے لوگ اسکوٹروں کو روکتے ہیں۔ مگر اسکوٹر والے اوّل تو گنجائش سے زیادہ سواریاں لئے جان بچا کر بھاگے جا رہے ہیں۔ اور اگر کسی کے یہاں ایک آدھ گنجائش بھی ہے۔ تو وہ سوچتا ہے کہ اگر پانی میں رُک گئے تو پھر رُک گئے ——

"میرے پرانے شہر میں سڑک کی دونوں جانب گہرے نالے ہیں۔ اس لئے پانی رکنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا —— زمین دوز نالوں میں پانی کی نکاسی میں دیر ہوتی ہے اس لئے پانی سڑک پر جم جاتا ہے ——"

کون سی دنیا اچھی ہے یہ کون بتائے ــــ

اتنے ہی میں ایک رکشے والا سر پر برساتی رکھے گانا بجاتا ادھر سے گذرتا ہے۔

اس پر وہ جھنجلایا ہوا تقریباً چیخ اٹھتا ہے۔

'یہ کونسا موقع ہے گانے بجانے کا' ــــــ

سیڑھی پر کھڑے لوگوں میں بیک وقت دو افراد اس رکشے والے کو آواز دیتے ہیں وہ رُک جاتا ہے اور وہ دونوں بھاگتے ہوئے جاتے ہیں اور رکشے پر جا بیٹھتے ہیں۔

جھنجھلایا ہوا فرد تھوڑی دیر کو خاموش ہو جاتا ہے۔ اب وہ دونوں کھڑے ہونے میں ایک ذرا فراغت محسوس کر رہے ہیں۔

ان کے درمیان سے کافی وقت نکل چکا ہے اس لئے دوسرا شخص بھی کسی قدر بیزار سا دکھائی دینے لگا ہے۔

"آخر بارش ہوتی ہی کیوں ہے" ــــ جھنجلایا ہوا شخص پوچھتا ہے۔

میں نے کتابوں میں پڑھا ہے، اس سے کھیت سیراب ہوتے ہیں اور منڈی میں ..... " ــــ

یہ کہنا مشکل ہے کہ بارش کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا ــــ

ان میں سے ایک آسمان پر دیکھتا ہوا کہتا ہے ــــ " بہتر ہے کہ اب نکل چلیں، بارش تو رکنے کا نام نہیں لیتی ــــ "

لیکن جھنجھلایا ہوا فرد اسے روک دیتا ہے ــــ " بری طرح بھیگ جاؤگے ــــ "

معاً ایک اور شخص سیڑھی سے اُتر کر اسکوٹر کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

"اب تو یہ جگہ عافیت کی ہوئی ہے اور تم چلنے کو کہتے ہو ــــ "

اتنے میں ہی گیس بتی والے کی بتی بجھ جاتی ہے اور وہ ایک گذرتے ہوئے رکشے کو آواز دیتا ہے۔

اس بیزاری کے عالم میں بھی وہ دونوں خوش ہو جاتے ہیں کہ اب اس سیڑھی پر اتنی جگہ ہے کہ وہ باآسانی ایک قدم آگے بڑھ سکتے ہیں، ایک قدم پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہیں اور منظر کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہیں۔

بارش کم و بیش اسی رفتار سے ہو رہی ہے۔ لیکن ہوا تھک ہار کر اپنے گھر کو لوٹ گئی ہے۔ سڑک کی روشنی میں وہ برستے مینہ کا منظر دیکھ رہے ہیں، جو ایک خاص زاویے سے برس رہا ہے اور جس کی بدمستیاں اور اٹکھیلیاں ہوا کے جاتے ہی ختم ہو چکی ہیں۔

ہوا کے چلے جانے سے وہ بارش کے جھونکوں سے محفوظ ہیں اور عافیت سی محسوس کر رہے ہیں۔

باقی بچے ہوئے افراد بھی ایک اسکوٹر کو آواز دے کر وہاں سے بھاگ نکلتے ہیں۔

اب صرف وہ دو رہ گئے ہیں۔

بارش کے قدم کچھ دھیمے پڑ گئے۔

جس شخص نے پہلے بھی ایک بار چلنے کو کہا تھا، وہ پھر کہتا ہے۔ "اب چلے ہی چلو"

"نکلو گے تو بھیگ جاؤ گے۔ یہاں تو اب عافیت ہی عافیت ہے۔" لیکن وہ کچھ بے قرار سا ہو چلا ہے اور اُسے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ شیشے کا دروازہ بار بار دستکیں دے رہا ہے:

"سوچو ذرا..."

لیکن اس کا جھنجلایا ہوا رفیق ایک بار پھر تیز لہجے میں کہتا ہے۔ "اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ذرا بارش رُک جانے دو۔ پھر ہم اطمینان سے کہیں چل کر چائے پئیں گے اور کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر اس تکدر کو دور کریں گے جو بارش نے پیدا کیا ہے۔ اور پھر اپنی اپنی راہ لیں گے —"

"بس ذرا بارش رُک جانے دو ——"

۱۹۷۵ء

——— ❖ ———

ورثہ

ایک گاؤں کا قصہ ہے کہ وہاں ایک شخص رات کے سناٹے میں تازہ قبروں سے مردے برآمد کرتا، ان کے کفن چراتا اور پھر انہیں ان کی قبروں میں واپس پہنچا دیتا۔

بظاہر تو یہ عمل بے حد دشوار گذار نظر آتا ہے، لیکن اس چور کو ایک منتر آتا تھا جس کے پڑھتے ہی مردہ قبر سے برآمد ہوتا، اپنا کفن اتار کر چور کے حوالے کرتا اور پھر سر جھکا کر اس کے حکم کی تعمیل کے لئے کھڑا ہو جاتا۔ چور کفن تہہ کرنے سے پہلے دوسرا منتر پڑھتا۔ اب کے اس منتر پڑھنے پر مردہ الٹے قدموں قبر میں واپس چلا جاتا اور قبر برابر ہو جاتی۔

چور کفن سمیٹ کر، اندھیرے کا جگر چیرتا نکل کھڑا ہوتا اور دوسرے دن بازار کھلنے پر کفن کا سودا کر لیتا۔

یہ علم سینہ بہ سینہ کئی پشتوں سے اس کے خاندان میں چلا آ رہا تھا۔ اس طرح کئی پشتوں سے اسکے گھر میں دولت جمع ہوتی چلی آ رہی تھی۔ ہر پشت نے دولت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا تھا

کفن بیچ کر وہ دام کھرے کر لیتا اور پھر تازہ مہم پر نکل کھڑا ہوتا۔ کس گھر سے کا نچا اور کفن کی بو

آئی ہے؟ اگر اپنے گاؤں میں کوئی موت نہ ہوئی ہوتی تو نزدیک اور دور کی بستیوں کی سمت نکل جاتا۔
اس طرح جویندہ یابندہ کے اصول پر اسے کہیں نہ کہیں تو اچھی خبر مل ہی جاتی۔
اکیلا اس خاندان کا تھا جو اس آبادی میں اس علم سے بہرہ ور تھا۔ اس طرح اس پیشے میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ اس کے آبا بھی بلا شرکت غیرے اس کاروبار سے نفع کماتے رہے تھے۔
اور اس کا یہ پیشہ ایک ایسا راز تھا جس سے بستی کے کم وبیش بھی عاقل و بالغ کما حقہٗ واقف تھے۔
اور عام خیال یہ تھا کہ جس طرح خیاطی، پارچہ بافی، زردوزی اور آہن گری پیشے ہیں اسی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے۔
ہاں مگر جب کبھی اس معمورے میں لوگ یکجا ہوتے، سرِ شام چوپال میں، کسی تقریب میں یا کسی دوست کے گھر پر تو پھر کتنی ہی باتوں کے ساتھ ساتھ اس کے پیشے کا بھی ذکر آجاتا۔
'یہ پیشہ کیسا پیشہ ہے' ——
'آہ........' ——
کفن چور بھی اکثر چوپال میں آجاتا، سماجی تقریبات میں شریک ہوتا اور ان کے سکھ دکھ میں ان کا ساتھ دیتا۔
بس ایک 'آہ' تھی جو اس کا ذکر آتے ہی دلوں سے نکل جاتی تھی۔
دنیا کا دستور ہے کہ جو یہاں آتا ہے وہ یہاں سے جاتا بھی ہے۔ چنانچہ ایک دن اس کا بھی آخری وقت آگیا، اور اس نے چاروں بیٹوں کو بلا کر دنیا کا اونچ نیچ سمجھایا۔ یہ مال و متاع یہ جاہ و حشمت پر یہ کہ میرے بعد میرے کاروبار کو فروغ دینا ——
یہ کہہ کر وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔
لڑکے روئے دھوئے۔ چالیس دنوں تک اس کا غم منایا اور بعد اس کے اپنے مال و اسباب پر نظر دوڑائی اور ان کا حساب کتاب کیا۔ تب لڑکوں کو یہ معلوم ہوا کہ باپ اتنا چھوڑ گیا ہے کہ بغیر کچھ کئے دھرے بھی فراغت سے گذر ہو سکتی ہے۔
یہ سوچ کر وہ آرام سے گھر بیٹھ رہے اور باپ دادا کی حاصل کی ہوئی جائداد کو اپنے تصرف میں لانے لگے۔

گاؤں والوں کو جب معلوم ہوا کہ لڑکے آبائی پیشہ ترک کر چکے ہیں تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی ___ بحمداللہ کہ اب مُردوں کے دن پلٹے۔

لیکن تب یہ ہوا کہ باپ باری باری چاروں بیٹوں کے خواب میں آیا اور کئی دلوں تک آتا رہا ___

'میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنے آبائی پیشے کو فروغ دینا' یہ آخر تم کیا کر رہے ہو ___

اس پر بیٹوں کو سخت ندامت ہوئی کہ ابھی باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے اس کی نصیحت کو یک قلم فراموش کر دیا۔

وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور یہ فیصلہ کر کے اُٹھے کہ انہیں باپ دادا کے کاروبار کو بہر حال زندہ رکھنا ہے۔

اور یہ کرنے کے بعد انہوں نے ایک نئی قبر کا سراغ لگایا اور جب رات کا اندھیرا ہر سو پھیل گیا تو وہ اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

وہ آگے پیچھے قبرستان کی راہ پر چلے جا رہے تھے۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں تھیلا تھا، جس میں ایک تیز سا چاقو پڑا تھا۔ ان کے دلوں میں شادیانے بج رہے تھے ___ باپ کی روح خوش ہو جائے گی۔

تازہ قبر پر پہنچ کر بھائیوں میں سے ایک نے اپنا وہ خاندانی منتر پڑھا تھا قبر شق ہوئی، مردہ برآمد ہوا اور بڑی سرعت سے اس نے اپنا کفن اتار کر ان کے حوالے کیا اور پھر ان کے حکم کے انتظار میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

اتنے ہی میں ایک بھائی نے تھیلے سے چاقو نکال کر مردے کی ناک کاٹ لی۔

نہ لہو، نہ تڑپ، نہ کوئی احتجاج ___ بس ایک سرد سی شے اس کے ہاتھ میں آ گئی جسے اُس نے زمین پر پھینک دیا۔

دوسرا منتر پڑھنے پر مُردہ قبر میں واپس چلا گیا۔ اس پر انہیں اطمینان سا ہوا کہ کاروبار بھی شروع ہو گیا اور رگ رگ و پے میں گرمی بھی آ گئی۔

لیکن جب بازار میں کفن بکنے کی خبر ملی تو بستی والے سناٹے میں آ گئے کہ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ کفن کی چوری باپ پر ختم ہو گئی۔

شدہ شدہ انہیں یہ خبر بھی ملی کہ وہ مردوں کے عضو بھی کاٹ لیتے ہیں' ان کے دل بھاری ہو گئے۔

دوسری رات وہ چاروں پھر ایک تازہ قبر کا سراغ پا کر قبرستان پہنچے۔ آج ان کے تھیلے میں تیز چاقو

کے علاوہ آری اور ہتھوڑی بھی تھی۔

منتر پڑھنے پر مُردہ برآمد ہوا اور اس نے اپنا کفن ان کے حوالے کر دیا۔ تب ہی بیٹے والے نے آگے بڑھ کر مُردے کے دونوں کان کاٹ لئے اور اس کے بعد آری اور ہتھوڑی کی مدد سے کہنیوں تک اس کے ہاتھ بھی قلم کر دیئے، اور انہیں قبرستان کے آسمان میں اچھال دیا۔ دوسرا منتر پڑھنے پر کٹا پِٹا مُردہ اپنی قبر میں واپس چلا گیا۔

کفن سنبھال کر وہ اپنے گھر کو چل دیئے۔ وہ آج کی کارروائی سے بے حد مطمئن تھے اور انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی کئی پشتیں ان کے ساتھ ہنستی ہوئی، انہیں مبارکبادیاں دیتی چلی آ رہی ہیں۔

لیکن جب مرشلم بستی کے لوگ چوپال میں اکٹھے ہوئے تو ان کے دلوں میں خاک سی اڑ رہی تھی۔

'ان کا باپ تو پھر بھی معصوم تھا کہ صرف کفن ہی چراتا تھا' ——

'یہ تو کفن بھی چراتے ہیں اور مُردے کی بے حرمتی بھی کرتے ہیں' ——

'اُف اُف'

۱۹۷۵ء

——— ٭ ———

روشنی، روشنی

ہماری آوازکو اندھیرے کے اس عفریت سے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔

آنکھیں اُجالے ہی سے روشن ہوتی ہیں۔ روشنی بُجھی اور تب ہم سب بُجھے، اور اب انتظار ہے اس ساعت کا جو اپنے جلو میں ایک بقعۂ نور، تازہ اور حیات بخش ہوا کا جھونکا بھی لائے گی۔

فی الحال تو عالم یہ ہے کہ ہم سناٹے میں ہیں کہ یہ کیا ہوا؟ اور کب تک کے لئے؟ گرمی سے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہیں اور پسینہ جھلسے ہوئے جسم کی، سوکھے ہوئے جسم کی آبیاری کے لئے نکل پڑا ہے، جس نے ایک مسئلہ یہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ رومال سے چہرہ پونچھیں یا اپنے ہاتھ کے پنکھے کے طور پر استعمال کریں۔

لیکن تاریکی بہرحال آنکھوں کو تاریکی بخش رہی ہے۔

اچانک سیاہ لبادہ اوڑھے بڑی گھنگھور گھٹائیں اُٹھیں۔ ہم نے دیکھا کہ چاروں اُور سے ہال کے کونے کانٹرے سے، پہاڑ جیسا جسم، آبنوسی شہتیروں جیسے ہاتھ اور ستون جیسی ٹانگیں نمودار ہو رہی ہیں۔

وہ سب الگ الگ دیر تک ہال کے چکر کاٹتے رہے، یا شاید گھٹا میں اس اندھیرے سے انھیں

متعارف کراتی رہیں، ان کی آنکھیں کھلواتی رہیں۔

پھر یوں محسوس ہوا کہ گھٹاؤں نے اپنا کام تمام کر لیا اور وہ پیر میوں کی راہ سے واپس ہو گئیں لیکن جاتے وقت چپکے سے اس بلا کو کہہ گئیں کہ تم یہیں رہو اور پھر تو ما بجیں اور دست و بازو جو الگ الگ چکر کاٹ رہے تھے اچانک اس جسم سے آملے جو گھٹاؤں کے جاتے ہی قطب سا بن گیا تھا۔

ہم سادھے اللہ آمین کر رہے تھے اور اپنی ہی دھڑکن کو ایک ایک کر کے گن رہے تھے۔ شاید یہ دھڑکن آخری ہو۔ شاید یہ دھڑکن آخری ہو۔ اور جب یہ ساری دھڑکنیں ختم ہو جائیں گی تو پھر ایک لق و دق میدان کا سفر شروع ہو جائے گا۔

تب ہی ہال کی چاروں سمت سے سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ یہ سرگوشیاں صاف صاف سنائی دینے والی آوازوں میں تبدیل ہو گئیں۔

پھر وہ تیز سی سیٹیاں بن گئیں جو چند ساعتوں کے بعد چنگھاڑنے لگیں۔

اتنے ہی میں ہم نے دیکھا کہ اس دیوزاد کا ایک پاؤں ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم توبہ و استغفار میں لگ گئے کہ بس دو چار ثانیے کے بعد یہ بھیانک بلا ہمارے اوپر آگرے گی اور پھر ہم ....

پھر ہم ....

ہلکی ہلکی 'شی شی' جو اس دیوزاد کی نظر بچا کر ہمارے گلے سے برآمد ہو رہی تھی، اس گھٹی گھٹی چیخ سے ملتی جلتی تھی، جو بھیانک خواب دیکھتے وقت ہمارے منھ سے نکل جاتی ہے، اور جسے سن کر کوئی پاس پڑوس سے کہتا ہے 'لاحول' پڑھو تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔

لیکن یہ دیوزاد تو ایک حقیقت تھا جس کا ایک پاؤں تو ہال کے ایک تہائی حصے کو اپنے احاطے میں لے کھڑا تھا، اور پھر ایک تہائی غیر آباد علاقے کے بعد وہ آخری تہائی آتی تھی جہاں ہم سب بیٹھے تھے اور جہاں اس کا دوسرا قدم بس آہی رہا تھا۔ ثانیے دو ثانیے اور بس۔ ہم پسینے میں بھیگ چکے تھے۔

کیسی عجیب بات تھی کہ مارے گئے تو اس عالم میں کہ احباب کی مجلس جمی تھی، ہم سب بے حد خوش تھے۔ ہم سب بول رہے تھے سن رہے تھے کہ اچانک اندھیرے نے ہم پر ہلہ بول دیا۔ اور اب یہ ہے کہ احباب تو احباب، خود ہمیں اپنی خبر بھی نہیں ملتی۔ اپنے جسم کے پسینے کا، تیمم بننے کا اور بکھرنے کا منظر تک ہم نہیں

دیکھ سکیں گے کہ اس اندھیرے میں شاید یہ سیاہ فام ہی نظر آتا ہے۔ باقی ہر شے ـــــ

بات اب ایک ثانیے کے ایک چھوٹے سے فریکشن کی کی جائے، جس نے میرے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اب بھی موقع ہے سرپٹ دوڑ جاؤ۔ لیکن فوراً ہی دوسرے فریکشن نے کہا ـــــ پاگل ہوئے ہو اس طرح شاید تم انسانی شکنجہ سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے، ہر چند کہ اس کی امید بھی کم ہی تھی، لیکن یہ تو دیوزاد ہے کہ صرف اس کی آواز کا شعلہ ہمیں خاک میں ملا دے گا، صرف اس کے نتھنوں کی سموم ہمیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دے گی اور صرف اس کی نظر کی برچھیاں ہمارے پرخچے اڑا دیں گی۔ سو عافیت اسی میں ہے کہ سانس روکے یونہی اس کے قدم کے نیچے پڑے رہو۔ ایک موہوم سی امید تو ہے، بلکہ یوں سمجھو کہ امید کے تنکے کا ایک مہین سا سیکشن تو اپنے پاس ہے جو بتاتا ہے کہ شاید جان بچ جائے ـــــ شاید ـــــ

وہ دو چار ثانیے بھی ختم ہو چکے ہیں، اور اب اس کے قدم کے ستون کو ہم براہ راست اپنی پیٹھ پر محسوس کر رہے ہیں۔ یہ بوجھ جو تیزی سے اپنا حجم بڑھا رہا ہے شی شی ـــــ

بوجھ کچھ اور بڑھا۔ شی ـــــ

اب وہ اپنی بلندی اور پھیلاؤ سمیت جم سا گیا ہے۔ "شی" ڈوب گئی۔

ہماری بکھری بکھری سوچیں اور ہماری اکھڑی اکھڑی سانسیں۔

خوابناک آوازیں ہر چہار طرف سرد پڑ چکی ہیں، اور دبے ہوئے، کچلے ہوئے لوگ اپنے جسم کے دریاؤں میں ڈوب رہے ہیں۔

اور اب ہم سناٹے کی پرشور آواز کے دوش پر ایک ایسا سفر کر رہے ہیں جو چشم زدن میں ازل سے ابد تک، اور تحت الثریٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی راہیں طے کر لیتا ہے۔ ہم سیال بن گئے ہیں یا وقت سیال بن گیا ہے۔ ہم برق و بخارات میں تبدیل ہو گئے ہیں یا وقت برق و بخارات میں ڈھل گیا ہے۔ ہم آواز بن گئے ہیں یا ہم نے روشنی کا جسم اپنا لیا ہے۔

یعنی یہ کہ ایک تیز رو سفر ہے۔ ایک ایسا برقی شعور ہے جو بس شائیں شائیں کرتا گذرتا ہی جا رہا ہے۔ وقت پیچھے چھوٹ گیا ہے، ارض و سما پیچھے چھوٹ گئے ہیں۔ ہر شے دائرے سے باہر ہو گئی ہے۔

اس طرح اگر کوئی احساس چاہے کہ اس برق و رعد کے سفر میں رخنہ ڈالیں تو وہ گویا ہتھیلی پر سر

رکھ کر آتا ہے۔

تب ہی ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس جی داری کے ساتھ ایک احساس در آیا۔ ایک بار پھر مہیب گھٹا اٹھی اور گرد و غبار کا طوفان آسمان تک پہنچ گیا اور ایک اجنبی سی سوندھی خوشبو اس ڈوبے ہوئے جسم میں اس شائیں شائیں کرتے شعور کے سفر میں کسی طرح بہت سی بندشیں اور بہت سی حدیں توڑ کر ناک کی راہ سے گھس آئی۔

یہ سفر کس منزل پر پہنچ کر دم لے گا۔ یہاں یا وہاں؟ —— کہ ہم تو جیسے بگولوں کا قافلہ بن کر رہ گئے ہیں —— یہ آخر کون سی زندگی ہے؟ کہ جو زندگی ہمیں ودیعت کی گئی تھی اس میں تو ہر سفر کے بعد ایک قیام اور ہر قیام کے بعد ایک سفر کا سلسلہ جاری تھا۔

لیکن اس بار شائیں شائیں کے اس سفر میں اس اجنبی خوشبو کے بعد ایک اور احساس نے ہماری راہ روکی کہ گھٹاؤں کے بطن سے بہت سی پستہ قد مخلوق برآمد ہوتی جاتی تھی۔

یہ پستہ قد مخلوق آناً فاناً اس دیوزاد کے چاروں طرف حلقہ بنا کر ناچنے لگی، ساتھ ہی ساتھ وہ تالیاں بھی بجاتی جاتی تھی اور مسخرگی میں اس کا منھ بھی چڑھاتی جاتی تھی۔

ہماری بے حس آنکھیں اس منظر کے سامنے کھلی تھیں۔ لیکن ہمارا شعور تو روشنی کی رفتار سے سفر کر رہا تھا۔

اچانک دیوزاد نے زور دار پھنکاریں ماریں۔ ہر چند کہ ہم اس کے پاؤں تلے دبے ایک بے پناہ سفر میں مبتلا تھے، پھر بھی ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس مخلوق نے فی الفور کوئی شے جسم پر انڈھیلی، جس سے دیوزاد کے نتھنوں کی آگ، اس کے اپنے نتھنوں میں لوٹ گئی۔

تب وہ اپنے دوسرے پاؤں کے نیچے انھیں روند دینا چاہتا لیکن وہ اسے دھوکہ دے کر اس کی پنڈلیوں پر چڑھ جاتے اور اپنے ہتھیاروں کو اس کی جلد میں اس سلیقے سے چبھوتے کہ اس کے جسم سے ایک بھی قطرہ خون کا نہیں نکلتا۔

اس پر وہ انھیں ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرتا، لیکن وہ شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے چاروں اور گشت لگانے لگتے اور بھنبھنانے لگتے —— وہ تنگ آ کر دوسرا ہاتھ بڑھاتا۔

پر اس بار بھی دب جاتا۔

اتنے میں ہی ہماری بے جان سی آنکھوں اور برق کے دوش پر اڑتے ہوئے شعور نے یہ محسوس کیا کہ

دہال پستہ قدوں کی ایک نئی کمک روزن و در کی راہ سے پہنچ رہی ہے۔

دیوزاد کی پھنکاریں اس کی آنکھوں کی بجلیاں اور نتھنوں کا سموم بھی بیکار ثابت ہو رہی تھیں کہ انھوں نے خدا جانے کون سی بڑا اوڑھ رکھی تھی کہ یہ سارے ہتھیار واپس لوٹ جاتے۔

ایک طوق سی شے دیوزاد کی گردن میں لٹکی تھی۔ پستہ قد اس کے جسم پر چڑھ رہے تھے۔ دس بیس گرتے تو دس بیس چڑھنے میں کامیاب بھی ہو جاتے وہ دس بیس کو اپنے ہاتھ سے مسل دیتا تو دس بیس اسے دھوکہ بھی دے جاتے۔

بجلیاں سی کڑک رہی تھیں اور کئی بار دیوزاد چیختے ہوئے اپنے محور پر چکر لگا چکا تھا۔

اچانک ایک ایسا شور بلند ہوا کہ گنبد نیلوفری سے ٹکرا کر دیر تک اس کی آوازِ بازگشت کرتی رہی۔

ایک پہاڑ اپنی بنیادوں سے اکھڑ کر روئی کے گالے کی طرح بکھر گیا تھا۔ ایک سمندر آسمان تک اٹھ کر پھر اپنے ہی ظرف میں آ گرا تھا۔ ایک زمین جس کی کوکھ معدنیات سے بھری پڑی تھی، پھٹ کر سارے عالم میں منتشر ہو گئی تھی۔

اور اسی ساعت ہمارے شور کے برق پیمانے دم توڑ دیا۔ ہم نور کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے تھے اور ایک تازہ ہوا کے جھونکے نے گویا ہمیں دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔

اور روشنی کے اس دیار میں ہمارے سامنے ایک طوطا مرا پڑا تھا۔

سنہ ۱۹۷۵ء

——— ⁂ ———

خط، منحنی

میرے سامنے ہسپتال کے احاطے کی پھیلی ہوئی دیوار ہے، جو ایک طرف تو ایک وسیع چوراہے پر ختم ہوتی ہے اور دوسری طرف ہسپتال کے اندر جانے والے گیٹ پر، جس کے پہلو میں ایک باہر جانے والا گیٹ ہے اور جس سے متصل ایک بس اسٹاپ ہے۔ ایک فلورسنٹ ٹیوب اس بجلی کے کھمبے میں روشن ہے جو چوراہے سے قریب والے سرے پر کھڑا ہے، اور دوسرا ٹیوب گیٹ والے کنارے پر ——— ان دونوں کے درمیان دیوار کی جانب کوئی روشنی نہیں ہے۔

دیوار سے ملی ہوئی جو سڑک ہے اس پر گاڑیاں آتی ہیں، لیکن دوسرے رخ پر جو سڑک ہے جس پر گاڑیاں جاتی ہیں، اس کے کنارے فٹ پاتھ سے ذرا پرے کافی روشن سی دوکانیں آباد ہیں، جن میں فلورسنٹ ٹیوب بھی لگے ہیں اور سادہ بلب بھی دکھائی دیتے ہیں۔

ان دونوں سڑکوں کے درمیان جو روش ہے، وہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر اپنا سینہ کھول کر ان دونوں سڑکوں کو ملا دیتی ہے۔ اس روش پر جابجا بجلی کے کھمبے لگے ہیں، جن میں دونوں جانب بلب آویزاں ہیں۔

ہسپتال کی دیوار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ذرا سناٹا ہے، کیونکہ بس اسٹاپ یا تو گیٹ والے سرے پر ہے، یا پھر چوراہے کی دوسری جانب ہے۔ اس طرح اس دیوار کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی دنیا، اس ہنگامے اور بھیڑ بھاڑ میں رہتے ہوئے بھی اس ہنگامے اور بھیڑ بھاڑ سے دور ہے — سمندر میں ایک جزیرے جیسی —

دیوار کی پشت پر لان ہے جس کے بعد از زمین تا فلک ہسپتال کی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔

ہسپتال کے گیٹ میں کاریں، ایمبولنس اور اسکوٹریں ایک گیٹ سے آتی ہیں تو دوسرے گیٹ سے نکلتی ہیں۔

دونوں طرف لیمپ کی روشنی کافی پھیل چکی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا، دیوار والی سمت چونکہ لیمپ پوسٹ فاصلوں پر ہیں، اس لئے ادھر جو اُجالا ہے وہ دوسری سمت سے مستعار لیا ہوا اُجالا ہے — نہ چیختا ہوا نہ قہقہے لگاتا ہوا، بس خاموش خاموش سا اُجالا —

دیوار کی دوسری جانب سڑک کے کنارے فٹ پاتھ سے پرے چند ایک پھل کی دوکانیں ہیں، جن میں تازہ پھلوں کا رس بھی ملتا ہے۔ میں ایک دوکان سے سنترے کا رس لیتا ہوں۔ بڑے گلاس کا انتخاب میں نے یوں کیا ہے کہ میرے سامنے دوسری سڑک کی سمت جو دیوار ہے وہاں ایک ایسا منظر ہے جو دیر سے تھما ہوا ہے — اور میں سوچتا ہوں کہ شاید کسی لمحہ وہ منظر جاگ اُٹھے، حرکت میں آجائے۔

تو جو منظر میری نگاہوں کے دائرے میں ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص اس گول تختی کے اسٹینڈ سے لگا کھڑا ہے، جس پر ایک ہارن کی تصویر بنی ہے، کراس کئے ہوئے ہارن کی تصویر۔ جو اشارہ ہے اس بات کا کہ یہ ہسپتال کا علاقہ ہے، ادھر ہارن مت بجاؤ، خاموشی سے اپنی گاڑی آگے ہانک لے جاؤ —

اُس شخص کے آس پاس، دیوار کے اس سرے سے اس سرے تک کوئی دوسرا تو نہیں — ہاں ایک شخص اس سے کچھ دور پرے وہاں کھڑا ہے جہاں ایک فقیر ٹاٹ بچھائے دھیمے سروں میں صدائیں دے رہا ہے۔

یہ دونوں میرے لئے عقدۂ لاینحل ہیں — ایک جو کراس کئے ہوئے ہارن کے اسٹینڈ سے چپکا کھڑا ہے اور دوسرا جو ٹاٹ بچھائے فقیر کا ہمسایہ ہے۔ جو شخص کراس کئے ہوئے ہارن کے اسٹینڈ سے لگا کھڑا ہے،

وہ آگے پیچھے اوپر نیچے بھی دیکھتا جاتا ہے۔ اُس کا ایک ہاتھ تو بیگ سنبھالے ہے اور دوسرا پتلون کی جیب کے اندر ہے اور یہی ہاتھ کبھی کبھی جیب سے رومال نکال کر تیزی سے اپنا چہرہ پونچھتا ہے اور پھر اسی جیب میں رومال کے ساتھ گم ہو جاتا ہے۔

لیکن وہ شخص جو فقیر کے پاس کھڑا ہے اپنے ارد گرد سے قطعی بے تعلق سا ہے۔ فقیر کو سکہ دینے کے بعد میں نے سمجھا تھا کہ وہ آگے بڑھ جائے گا، لیکن وہ وہیں کھڑا رہا۔ بالکل ہی بیگانہ سا، کبھی چوراہے کی سمت دیکھتا ہوا، جہاں ریڈ لائٹ پر بسیں، کاریں اور اسکوٹریں کھڑی دکھائی دے رہی ہیں۔ کبھی دیوار کے دوسرے کنارے سے آگے والے بس اسٹاپ کی طرف گھورتا ہوا۔

میرے سامنے جو پہلو بہ پہلو دو سڑکیں ہیں، ان پر مسافر بردار گاڑیاں، ہر دوسری ساعت رک جاتی ہیں اور ہر دوسری ساعت چل کھڑی ہوتی ہیں ——— جب گاڑیاں چل کھڑی ہوتی ہیں، تو وہ دونوں باری باری اُبھرتے اور اوجھل ہو جاتے ہیں اور مجھے ٹیلیویژن کی وہ سچویشن یاد آجاتی ہے، جب تصویریں بار بار غائب ہو جاتی ہیں اور بار بار بہت سی لہروں کے دوش پر ایک تحریر ابھرتی ہے کہ ——— 'رکاوٹ کے لئے ہم معافی چاہتے ہیں'۔

لیکن جب ریڈ لائٹ پر گاڑیاں رک جاتی ہیں تو پھر وہ منظر سارے کا سارا میری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ میں گم یا نظاروں میں گم فقیر کے پڑوس میں کھڑا ہے اور اس سے ذرا دور ایک اور شخص، کراس کئے ہوئے ہارن کی تختی کے اسٹینڈ سے لگ کر کھڑا ہے، اوپر نیچے، ارد گرد کچھ دیکھتا ہوا، کچھ محسوس کرتا ہوا، کچھ آہٹیں لیتا ہوا۔ گاہے پشت کی جانب مڑ کر حالات کا اندازہ لگاتا ہوا۔ درآنحالیکہ اس کی پشت پر ایک ساکت وصامت سی دیوار کھڑی ہے ——— ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی، جس پر ایک تصویر والا پوسٹر جگہ بہ جگہ نظر آتا ہے۔

جہاں پر میں کھڑا ہوں وہاں سے یہ تصویر اپنی پوری جزئیات اور اپنے پورے خدوخال کے ساتھ مجھے نظر نہیں آرہی ہے، لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ وہ تصویر اپنی جزئیات اور پورے خدوخال کے ساتھ ہی مجھے نظر آرہی ہے ——— میں آپ کو بتاؤں یہ 'ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے' والا کھیلا نہیں ہے ——— بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ تصویر کئی دنوں سے میں مختلف مقامات پر دیکھ رہا ہوں ——— قریب سے بھی اور دور

سے بھی۔ اس لئے یہ تصویر فی الوقت دور ہونے پر بھی مجھ سے قریب ہے۔ ذہن میں تازہ ہے۔

یہ تصویر کس کی ہے میں کچھ نہیں جانتا، لیکن میرے اندر جو پچھلے دنوں کا انسان بستا ہے جو قدیم سے قدیم تر اور قدیم ترین کھالیں زیب تن کئے رہتا ہے۔ وہ بھی کہتا ہے کہ یہ تصویر اس کی دیکھی ہوئی ہے۔

یہ کوئی خاص تصویر نہیں ہے۔ نہ مرد کی نہ عورت کی، نہ بہار کی نہ خزاں کی، نہ تپتی ریت کی نہ ٹھنڈے پانی کے چشمے کی ــــــ در اصل یہ تصویر ایک کیفیت کی تصویر ہے جسے میں نے بھی دیکھا ہے اور میرے اندر قیام کرتے ہوئے پرانے لوگوں نے بھی۔

ہاں تو جیسا کہ میں نے ابھی کہا، یہ تصویر ایک کیفیت کی تصویر ہے، جو ایک ہیولیٰ سے بے حد اونچے سُروں میں "چپ رہو" کہلواتی ہے اور بس ــــ

چنانچہ اب یہ پورا منظر اس طور سے میرے سامنے آتا ہے (اس وقت جب گاڑیاں ریڈ لائٹ پر کھڑی ہو جاتی ہیں اور سڑک کا ٹریفک رک جاتا ہے) کہ ایک شخص کراس کئے ہوئے بازو کے اسٹینڈ سے ملا کھڑا ہے ـــ کچھ بے چاپن سا، اوپر نیچے، دائیں بائیں اور اپنی پشت پر دیکھتا ہوا، جہاں ایک "چپ رہو" والی تصویر دیوار پر چپکی ہوئی ہے ـــ اور اس سے کچھ دُور پر ایک اور شخص فقیر کے برابر کھڑا ہے بے تعلق سا کبھی ریڈ لائٹ کی جانب دیکھتا ہوا اور کبھی دوسری طرف دیوار کے آخری سرے سے، ذرا ہٹ کر بس اسٹاپ کو اپنی آنکھوں میں بسا لیتا۔

اور یہ منظر سگنل پوسٹ کے سبز مقام کی وجہ سے ڈوبنے ابھرنے لگتا ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو گاڑیاں کچھ دیر تک چلتی رہتی ہیں اور جب دوبارہ سُرخ روشنی ہوتی ہے تو پھر وہی تعطل اور ٹھہراؤ۔ بس کبھی کبھار بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے اور اُدھر سے آتے ہوئے اکا دُکا مسافر ــــ

میں بوندوں کے حساب سے جوس سِپ کر رہا ہوں، اس پر بھی اتنی دیر ہو چکی ہے کہ دو تہائی گلاس ختم ہو چکا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ ایک تہائی بھی ختم ہو گیا تو میں کیا کروں گا ـــ میں جو اس منظر کا اسیر ہوں، آخر کس بہانے سے یہاں کھڑا رہوں گا ـــ

اب گاڑیاں پھر ریڈ لائٹ پر کھڑی ہو گئی ہیں اور وہ منظر میری نظر کے سامنے آ گیا ہے۔ تب ہی وہ شخص بے حد چوکنا ہو کر اپنی پتلون کی جیب سے اپنا ہاتھ نکالتا ہے اور اُسے پوسٹر کی جڑوں تک پہنچا دیتا ہے۔ وہ

شخص جو فقیر سے لگا کھڑا ہے اسی طرح بے تعلق سا، کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب، دُور دراز علاقوں کی سیر کر رہا ہے۔

میں نے سوچا چلو اس منظر میں کچھ تو جان آئی، کچھ تو اس کا تعطل دور ہوا۔ عین ممکن ہے کہ میرا گلاس ختم ہونے تک اس کا ڈراپ سین ہو جائے۔

تب ہی گاڑیاں پھر چل کھڑی ہوتی ہیں اور اس منظر کے ڈوبنے اُبھرنے کی کیفیت پھر شروع ہو جاتی ہے۔

میرا گلاس کسی قدر گرم ہو چکا ہے۔ میں اس میں برف کا ایک تازہ ٹکڑا ڈلواتا ہوں اور پھر اُس وقت کا انتظار کرنے لگتا ہوں جب گاڑیاں رُک جائیں گی۔ اور وہ سامنے کی دنیا پھر ساحل پر آ لگے گی۔

اور جب گاڑیاں ریڈ لائٹ پر رُک گئیں تو میں نے دیکھا کہ بجلی جیسی تیزی کے ساتھ اُس ہاتھ نے ایک خطِ منحنی بنا کر اُس تصویر کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔

اور اب وہ منظر شاید آگے بڑھ چکا ہے!

۱۹۷۶ء

آگ کے ہم سائے

•

وہ چار جو خاموشی سے اکڑوں بیٹھے ہیں، ان کے گرد ایک پنسل رقص کر رہی ہے، اور چند ایک کاغذات اپنے فقروں سے جل کر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پناہ لے رہے ہیں۔ انکے درمیان ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی رکھی ہے۔

شہر میں یہ دستور چل نکلا ہے کہ پنسلوں سے صرف روزنامچے لکھتے ہیں، اور کاغذوں سے صرف حساب کی کتاب بنائی جاتی ہے۔ ہاں مجدوم چھپے کاغذوں کا ایک دفتر انھیں مل جاتا ہے، جسے وہ اپنے بند لبوں سے پڑھتے ہیں اور پڑھتے وقت آنکھوں کو کسی خس خانے میں ڈال دیتے ہیں کہ مبادا وہ جلنے لگیں — اس دفتر میں گنبد کی صدائیں تو جا بجا ملتی ہیں، مگر وہ صدائیں جو کوچہ و بازار کی ہوتی ہیں اور وہ صدائیں جو در و دیوار کی ہوتی ہیں......

تو وہ چاروں حصار بنائے بیٹھے ہیں۔ طاق پر ایک چراغ جل رہا ہے، جس کی روشنی میں وہ اپنے چہرے، اپنے سائے، پنسل، کاغذ، کاغذ کی تحریر اور اس انگیٹھی کو دیکھ رہے ہیں جو ان کے درمیان جل رہی ہے۔

اندر مکمل سکوت ہے۔ باہر بھی ایک گہرے سنّاٹے اور دل دہلا دینے والی خاموشی کا احساس ہوتا ہے، ہاں مگر ایک بھاری بھرکم بُوٹ کی کھٹ کھٹ ضرور سنائی دے رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتے کے رونے کی آواز بھی آ رہی ہے جو ہر روز رات کے سناٹے میں اپنے نالے بلند کرتا ہے اور سپیدہ سحر نمودار ہونے تک یونہی روتا رہتا ہے۔

بُوٹ کی کھٹ کھٹ اور سنگین کی پوزیشن بدلنے کی آواز قریب آ کر دُور چلی جاتی ہے اور دُور جا کر قریب آ جاتی ہے۔ شام ہوتے ہی یہ کہانی شروع ہو جاتی ہے، پھر صبح ہونے پر ایک خاموش سا شہر ایک دوسری داستان چھیڑ دیتا ہے۔

وہ چاروں جو اکڑوں بیٹھے ہیں، چراغ کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے ہیں، اور جب بھاری بھرکم بوٹ کی کھٹ کھٹ ان کے قریب آ کر ان سے دور ہو جاتی ہے، تو وہ بڑی سرعت سے کاغذ کے بے داغ چہرے پر ایک تحریر ثبت کر کے اسے دوسرے کو دے دیتے ہیں۔ وہ پڑھ کر اس پر ایک اور تحریر کا اضافہ کرتا ہے۔ پھر ایک اور، پھر ایک اور ——————

اس طرح جب ایک گفتگو ختم ہو جاتی ہے تو وہ کاغذ کو انگیٹھی کی تیز آنچ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کاغذ کی لاش جل کر سیاہ ہو جاتی ہے، تب ان میں سے کوئی ایک چھوٹی سی لکڑی سے اس لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے کہ کئی بار بھاری بوٹوں نے، کئی بار چمپاتی سنگینوں نے ان اکڑی لاشوں سے بھی استفسار کیا تھا اور کئی بار ان لاشوں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا بھی دیا تھا۔

اس واسطے اب وہ اکڑی لاشوں کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ بوٹوں کی دھمک دور ہو گئی تو پنسل حرکت میں آ جاتی ہے۔ کیونکہ غیر کاروباری اوقات میں آخر پنسل کا استعمال کیوں؟

—— چھپے کاغذ کیا کہتے ہیں؟ ——

—— وہ تو گنبد کی صداؤں کو کاغذ کا جسم دیتے ہیں ——

—— ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے ——

—— بار بار اور تا دیر ——

اتنے ہی میں ایک اکڑی لاش انگیٹھی سے پکار اٹھی ۔" انجام میں ہوں "

باہر ایک ہیبت سناٹا ہے جس کے علب سے کتے کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور بوٹوں کی دھمک اس سناٹے کے جگر کو توڑتی پھوڑتی باہر نکل رہی ہے۔

تب ہی پنسل نے کہا ۔

—— وہ کہتے ہیں شہر کے دروازے مضبوط کر لو ——

—— کہ دشمن باہر بھی ہیں اور دشمن اندر بھی ——

—— ایک دشمن اور بھی ہے ——

—— وہ ہمارے اندر بیٹھا ہے ——

ایک تازہ بے داغ کاغذ کو گفتگو کا جسم دینے اور تب اسے نذر آتش کرنے سے پہلے ان سبھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یوں بھی تو گفتگو ہو سکتی ہے کہ کوئی کچھ نہ بولے، کوئی کچھ نہ لکھے اور پوری گفتگو ہو جائے ۔" وہ دشمن کون ہے "

—— ہمیں شہر کو رشک فردوس بنانا ہے ——

—— ہمیں صرف کام کرنا ہے ——

—— تم نے مشینیں دیکھی ہیں ——

—— غور و فکر ہم نے گنبدوں کے سپرد کر دی ہیں ——

باہر اتھاہ سناٹے کے سینے سے بلند ہوتا ہوا کتے کا نالہ اور بوٹ کی کھٹ کھٹ ۔۔

گھر کے دروازے بند ہیں۔ شہر کی فصیلوں پر سنگین بردوش فوجی پہرے دے رہے ہیں اور گنبدوں والے محل سے ایک تیز روشنی نمودار ہو رہی ہے جو ایک بڑا دھارا بنا کر آسمان کا منہ دیکھتے ہوئے پھر نیچے لوٹ آتی ہے —— کہتے ہیں یہ روشنی اندھیرے کو اجالا دیتی ہے اور سکوت کو پل بھر کی گویائی۔

پنسل پھر حرکت میں آتی ہے۔

—— آسمان پر نہ تو چاند ہے اور نہ تارے ہیں ——

—— رات بالکل ہی تاریک ہے ——

—— جیسے ہمارا مقدر ——

—— یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح ہے ——

ابھی وہ کاغذ کے جسم کو آگ کی نذر کر ہی رہے تھے کہ باہر سنگین والے نے شاید پنسل کی گھرگھراہٹ سن لی اور اس نے سنگین کی پوزیشن بدلتے ہوئے کہا کون ؟

اور وہ جو اکڑوں بیٹھے تھے وہ اچانک چونک اُٹھے اور انہوں نے سب ہی کاغذوں کو انگیٹھی میں جھونک کر لکڑی سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے پھر لکڑی کو آگ میں ڈال دیا اور تب آخر میں انھوں نے پنسل بھی آگ میں پھینک دی۔

یکایک آگ بھڑک اُٹھی —— وہ پہلے انہیں سُرخ کر گئی اور پھر اس نے انھیں کاربن کی سیاہ لکیروں میں تبدیل کر دیا۔

"کون ہے" —— فوجی اپنی ٹارچ روشن کر کے دھاڑا۔

"دروازہ کھولو ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔"

تب ان میں سے ایک ڈرتے ڈرتے اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

"تم چاروں یہاں کیوں بیٹھے ہو۔"

پر وہ تو بولنا ہی بھول چکے تھے۔

"بولو میں حکم دیتا ہوں" —— فوجی دوبارہ دھاڑا۔

"بس یونہی" —— جواب دینے والے کی آواز میں بے حد ارتعاش تھا جیسے وہ آواز دیر سے کسی سرد خانے میں بند ہو ——

"ہوں —— ں ——"

"اور تمہارے درمیان یہ آگ ؟"

پہلی آنکھیں دوسری آنکھوں کی سمت نکل گئی ہیں، جو خود تیسری آنکھوں کی جانب سفر کر رہی ہیں، جو جسم زندان میں چوتھی آنکھوں کی منزل پر پہنچ چکی ہیں، جنھوں نے پھر ایک دائرے کی تشکیل میں ہاتھ لگا دیا ہے۔

باہر کتّے کے رونے کی آواز کچھ اور بھی بھیانک ہو گئی ہے، اور وہ سوال جو خوجی نے اٹھایا ہے وہ اب بھی جواب کے انتظار میں کھڑا ہے..

"اور تمہارے درمیان یہ آگ؟ ------

۱۹۷۶ء

------ ❖ ------
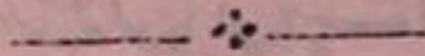
کھنڈروں میں بسے لوگ

وہ دن اتوار کا تھا۔

وہ کمرہ ایک ہوٹل کا تھا۔

اور وہ لوگ ———

بس ابھی ابھی آئے تھے اور ابھی ابھی چلے جائیں گے۔

وہ چشم زدن میں ہوا کے دوش پر سفر کرکے آئے تھے ——— ہزاروں میل کا سفر۔

وہ پانچوں آنکھیں وا کئے مسلسل اس کمرے کو دیکھ رہے تھے ——— جہاں پردے، فرش و فروش، صوفے، دیوان، مرکزی میز، چھوٹی میزیں، تپائیاں، ایش ٹرے ——— غرض سب کچھ تھا۔ نہیں تھا تو ایک آرام دہ بستر ———

حیران کی نگاہیں اپنے دوست کی طرف اٹھیں ——— اپنے میزبان دوست کی طرف ———

"سچ تو یہ ہے کہ ....

انھیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، کیسے آئے ہیں اور کب آئے ہیں لیکن کیوں آئے ہیں اس کی انھیں دور دور تک خبر نہیں تھی ——

تم لوگ کیا پیو گے؟ ——

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

اور وہ خود تو جیسے تپتے ہوئے صحراؤں سے جھلس کر آیا تھا۔

ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل۔

"شکر ہے خدا کا کہ تمھیں میرے تار اور میرے چیک مل گئے۔"

"تم نے کافی احتیاط برتی تھی، اور وقت سے بہت پہلے بھیجا تھا۔"

"ہاں —— اللہ ——

"تم لوگ کچھ دیر آرام کرلو۔ پھر میں یہ بتاؤں گا کہ میں نے تم لوگوں کو کیوں زحمتِ سفر دی۔ اس کے بعد میں تمھیں اپنی کوٹھی پر لے چلوں گا، جہاں ہم لنچ لیں گے۔ وہاں کچھ دیر آرام کر کے تم شام کی چائے کے بعد اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤ گے۔ میں نے شام کے پلین میں تم لوگوں کی سیٹیں بک کروالی ہیں۔"

کافی، چائے اور بیئر کے دور ختم ہوئے تو وہ تازہ دم سے دکھائی دینے لگے۔

"ہاں —— تو —— ان میں سے ایک نے بولنا چاہا تو اس نے اسے وہیں روک دیا۔

"تم لوگ بڑے بے صبر ہو۔ ذرا میں سگریٹ کے درمیان خود کو یکجا کرلوں۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں لنچ میں پورے دو گھنٹے باقی ہیں۔"

چند وقفوں کے بعد اس نے سگریٹ کی جانب دیکھا، وہ آخری منزل پر پہنچنے والا ہی تھا۔ اس سے دو ایک کش اور لگا کر اسے ایش ٹرے میں دبا دیا۔

پھر اس نے اٹھ کر کمرے کو اندر سے بند کرلیا، دروازے اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیئے اور اس قدِ آدم لیمپ کو کہ جس کے سر پر ریشمی دستار چڑھی تھی، روشن کر دیا۔

اب وہ سب ہمہ تن گوش تھے۔

"دوستو میں نے اپنی قبر تیار کروالی۔"

انھیں جھٹکا سا محسوس ہوا کیونکہ وہ سب 'الف' سے 'ے' کی جانب قدم بڑھانے کے عادی تھے۔ 'ے' سے 'الف' کی گردن میں تو ایک قدم چلنا بھی ان کے لئے مشکل تھا۔

انھیں حیرت تھی کہ آخر یہ گفتگو 'قبر' سے کیوں شروع ہوئی۔

سوچو تو اس دنیا میں قدم رکھتے ہی ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم عروج کی طرف بڑھ رہے ہیں کہ زوال کی طرف۔

"تمہارا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کوہ ندا کب اسے پکار اٹھے گا۔ سارا غور و فکر، سارے عقیدے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔"

"ہاں تو میری قبر تیار ہے۔"

"تمہاری طرح میرے بھی بال سفید ہو گئے۔ میرے بھی دانت بری طرح ہل رہے ہیں۔ میری بھی عینک تیزی سے اتر رہی ہے۔ اس کے علاوہ زوال کا ایک جان لیوا حملہ کس وقت اور کس عضو پر ہوگا کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ مجھے تو جوڑوں کے درد کی شکایت شروع ہو گئی ہے۔"

اس پر سبھوں نے اپنی اپنی شکایتیں اور اپنے اپنے عارضے گنائے۔ اس کے بعد بہت سی رسمی اور غیر رسمی باتیں چھڑ گئیں۔

ہاں تو سنو، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ـــــ ماں، باپ، بھائی، بہن، رشتہ دار، بال بچے" ـــــ

یہ سن کر دوستوں نے جلدی جلدی کئی ایک نام بتائے ـــــ

"ہاں ہاں، بہت لمبی فہرست ہے۔ میں بھی جانتا ہوں، لیکن سوچو کہ کیا ایک بامعنی 'نہیں'، سیکڑوں بے معنی 'ہاں' سے بہتر نہیں؟" ـــــ

"میں نے ساری زندگی انتھک محنت کی، پیسے کمانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی کیونکہ ـــــ" "جس دنیا میں جذبوں کی بھی قیمت لگ گئی ہو وہاں تو پیسے کے بغیر ایک قدم بھی چلنا ناممکن ہے بغیر دل کے کیا کوئی چلتے پھرتے جسم کا تصور کر سکتا ہے ـــــ"

"مسکراہٹ — ہنسی — خلوص و محبت، لطف و کرم — بے رحمی و شقاوت —
نشیب و فراز — ان سبھوں کی قیمتیں طے کردی گئی ہیں —"

"ایسے میں سوچو کہ کیا رنج و غم کے جذبے بلاقیمت حاصل کئے جاسکتے ہیں —"

"میں کسی بھی لمحے مرسکتا ہوں — ابھی، آج، کل، مہینے دو مہینے بعد — سال، دو سال، دس
سال بعد —"

"دوستو وقت کا بہاؤ بہت تیز ہے، اس لئے مجھے دس سال بھی ایک پل کی طرح لگتے ہیں اور
جب دس سال کا طویل عرصہ ایک بے حقیقت سا پل بن جائے تو پھر —"

"دراصل قبر ہم سبھوں کا مقدر ہے —"

"گفتگو کا نقص، یا شاید میری گفتگو کا نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ کافی کافی دیر کے لئے ایک جگہ ٹھہر سی
جاتی ہے۔ اس طرح اس کی روانی میں فرق آجاتا ہے —"

"ہاں تو میرے حسن انتظام کی تم بھی داد دوگے۔ میں نے ایک مذہبی ادارے کو ایک بڑی رقم اس
کام کے لئے دے رکھی ہے کہ جب میں مرجاؤں تو وہ اپنا غسال اور اپنا درزی بھیج دیں۔ قبر کے دیگر لوازمات
اور دس بیس جنازہ برداروں کا بھی انتظام کردیں۔ میں نے ان سے کہدیا ہے کہ میری قبر تیار ہے، مجھے اس میں
آرام سے لٹا کر مٹی ڈال دینا —"

"تمہاری اطلاع کے لئے ادارہ رونے دھونے والوں کا بھی انتظام کردے گا۔ پھر قل، چہلم،
برسی اور دوسری رسمات بھی وہی انجام دے گا۔ ادارے کی کارروائیوں کی دیکھ بھال کے لئے میں نے ایک
وکیل رکھ لیا ہے، جس کے اوپر تین معزز شہریوں کا ایک بورڈ مقرر کردیا ہے جو وکیل کی کارروائیوں سے مطمئن
ہونے کے بعد ہی میرا چیک اس کے حوالے کرے گا —"

"میں سمجھتا ہوں میرا یہ انتظام تمہیں پسند آیا ہوگا —"

انتہائی بے دلی سے انہوں نے اپنے سر ہلادیئے۔ ان کے آنے جانے اور ان کے چند گھنٹوں
کے قیام کے لئے اس نے ایک خطیر رقم خرچ کی تھی۔

"اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو پہلے میں مرجاؤں یا پہلے میری بیوی — اگر میری بیوی پہلے مرگئی

تو اس عالم میں اس کے کفن دفن کا سارا انتظام میں کروں گا اور میرے مرنے پر وہ ادارہ ــــ"

"ہاں میرا اثاثہ ــــ"

"سچ پوچھو تو میں نے اس کے متعلق اب تک کچھ نہیں سوچا ہے ویسے ایک عام دنیاوی دستور تو یہ ہے کہ مُردے کا مال قوم کا مال ــــ"

"لیکن اگر میں پہلے مر گیا تو میرا سب کچھ میری بیوی کا ہو گا۔ وہ اس وقت کسی بچے کو گود لے لیگی۔ وہ بیساکھی کی مدد سے چل سکتی ہے۔ میں تو بیساکھی لے کر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا ــــ"

"دوستو ساری پریشانیاں مجھے میری بیوی کی وجہ سے ہیں۔ یہ عجیب کارخانہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں مرد عورت کے بغیر نہیں چل سکتا اور عورت مرد کے بغیر نہیں چل سکتی۔"

"تو میری بیوی ایک دوسری ہی مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ محبت، خلوص، وفا، دوستی و بھائی چارگی ــــ یہ سارے جذبے اب بھی زمانے کی دست و برد سے بچے ہوئے ہیں۔ آج بھی سیم و زر ان تک نہیں پہنچے ہیں ــــ"

"وہ اگر پہلے مر گئی تو رشتے ناطے والوں کی سرد مہری اور بے وفائی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ پائے گی اور میں چونکہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں اس لئے انکی بے اعتنائی سے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچے گا، کیونکہ میں اُن سے بخوبی واقف ہوں ــــ"

"لیکن ساری مصیبت اس سوال پر کھڑی ہوتی ہے کہ اگر میں پہلے مر گیا تو ــــ"

"میں نے تو اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ نیک بخت، اب بھی ہوش میں آجا۔ تو اگر بغیر دام کے رونے رلانے والوں اور رحم کرنے والوں کی بھیڑ جمع کرنا چاہتی ہے تو تیرا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ ہاں مگر میرے پانچ دوست جو اہلِ دل بھی ہیں اور اہلِ خلوص بھی ــــ"

"خود یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں اپنی بیوی کو تمہارے متعلق کیوں فریب میں گرفتار رکھنا چاہتا ہوں۔ آخر میں کیوں اس کے ہاتھ میں امید کی پانچ روشن قندیلیں پکڑا دیتا ہوں کہ میں تو وہ ہوں جسے زندگی کی تیسری دہائی کے اوائل ہی میں یہ تجربہ ہو گیا تھا کہ بجز ایک مینار کے جو ہمارے ماضی بعید کا ایک حصہ ہے، جو ہمارے حافظے کے جگمگاتے کمرے میں بستا ہے، سارے مینار ہماری نظر کی گرمی سے پش پش

ہو جاتے ہیں ـــــ"

دوستو تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں ـــــ تم کیا ہو ـــــ کہاں کھڑے ہو ـــــ دلچسپ بات یہ ہے کہ تم سب بھی کبھی میرے مینار تھے جو وقت آنے پر یکا یک ہی آپ زمین بوس ہو گئے ـــــ"

"مگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کیا ہو اور کیسے ہو، میں نے تمہارے لئے بہت کچھ کیا ہے ـــــ میں نے تمہاری تجارت پر مضمون لکھے ہیں ـــــ بحیثیت صنعت کار اور تاجر تمہاری کاروباری صلاحیتوں پر میں نے بہت کچھ سپرد قلم کیا اور تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تم سے کبھی ان چیزوں کا معاوضہ نہیں مانگا ـــــ"

لیکن آج میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں کہ میں نے بھی یہ سارے کام بے غرض ہو کر نہیں کئے تھے ـــــ میری بھی تم سے ایک غرض اٹکی ہوئی تھی ـــــ"

ان کے چہروں پہ بے شمار سوالیہ نشان ثبت تھے۔

"تمہیں اپنی بیوی کی نظروں میں سرخرو رکھنا ـــــ"

اب ان کی الجھنیں نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھیں۔

اس نے اپنا بریف کیس کھولا، اور مضمون سے لیس پانچ پوسٹ کارڈ اس میں سے برآمد کئے۔

وہ پوسٹ کارڈ دیر تک ان کے حلقے میں گشت کرتے رہے۔

وہ نہ اس پر کچھ بول سکے اور نہ ہی اس پر کوئی رائے زنی کر سکے ـ وہ ساعتیں جو بے حد مبہم تھیں ـ وہ ساعتیں جو بے حد ناقابل فہم تھیں۔

ایک خاص بات انھوں نے یہ محسوس کی کہ پانچوں کارڈ کا خط، مضمون اور روشنائی ایک دوسرے سے مختلف تھی ـــــ یہ پانچوں کارڈ اس کی بیوی کے نام تھے ـــــ

"ہاں میں ہفت قلم ہوں اور تمہارے پوسٹ کارڈ لکھنے کے لئے میں نے پانچ مختلف روشنائیوں کا استعمال کیا ہے ـــــ"

ان میں سے ایک نے اپنا کارڈ بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا دوست اب اس دنیا میں نہیں رہے ـ خدا اس کی روح کو آرام پہنچائے ـــــ شریک غم ـــــ"

پانچوں پوسٹ کارڈ میز پر رکھے تھے۔

"دوست! میرے مرنے کے بعد تمہیں فقط انھیں پوسٹ کرنا ہے۔ مضمون اور پتہ لکھنے کی زحمت سے بھی تم بچ گئے۔"

"اب انھیں تم اپنے اپنے بریف کیس میں حفاظت سے رکھ لو ــــــ اور ایک کرم اور ــــ"

"اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ یہ فریب میری بیوی پر نہ کھلے ــــ۔"

"تمھیں میرے چیک مل چکے ہیں اور میرا اور تمہارا حساب صاف ہے ــ۔"

اور اب ایک گہرا سناٹا چھا چکا تھا ــــ

تب ہی اس نے گھڑی دیکھی اور سکوت کو توڑتے ہوئے کہا ــــ

"لنچ کا وقت ہو چکا، چلو اب گھر چلیں ــــ"

۱۹۷۶ء

ــــــ⁘ــــــ
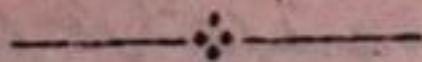
رُکی ہوئی گھڑی

مقبرہ ہوتا تو میرا جسم یہاں ہوتا اور میری روح کہیں اور بھٹکتی پھرتی، لیکن اس کے برعکس میں
اپنی روح تو یہیں چھوڑ گیا تھا اور اپنا جسم لئے سارے میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

میں یہاں سے کب گیا تھا، کل یا اس سے پہلے، کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی کہ یادوں کا چمن تو سدا
سے ہرا بھرا ہے، اس میں خزاں کہاں۔

مجاور نے قفل کھولا تو دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا —— "تم آگئے"۔

باوجود اس کے کہ کمرہ میرا مقبرہ نہیں تھا، میں کمرے کے نگہبان کو مجاور ہی کہوں گا کہ ساری رسومات
وہ اسی وضعداری کے ساتھ ادا کرتا تھا جس سے میری روح کو سکون ملے، ہر روز کمرے کی صفائی کرنا، زمین اور
فرنیچر کی گرد، چھتوں کے جالے۔ فرش سے عرش تک —— اور یہ سب کرنے کے بعد کوئی بے حد خوشبودار
اگربتی جلا دینا —— مطہر روح —— معطر کمرہ۔

یہی وجہ تھی کہ کمرے کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ بس ابھی چند لمحوں پہلے میں اسے بند کر کے گیا تھا اور
اب ٹہل گھوم کر واپس آگیا ہوں۔

لیکن دوسری ہی ساعت میں خود کو سمیٹتا، ان بکھرے دنوں کو سمیٹتا جو یہاں سے وہاں تک آسمان پر پھیلے ہوئے سفید بادلوں کے ٹکڑوں کی طرح افق تا افق چھوٹے چھوٹے خیمے نصب کئے کھڑے تھے۔

صبح کی پہلی کرن مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیتی، پھر چیختی مشینوں کا پھیلا نک دن سامنے آتا، بھاگتی بسیں، دوڑتے ہوئے لوگ اور شائیں شائیں کرتی ساعتیں، کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ رات گئے تک کا یہ شور اور پھر طویل طویل سفر کے اختتام پر گلی کا اونگھتا ہوا لیمپ، لوہے کے دروازے کی کھٹاک، فلیٹ کے دروازے کی چرچوں — یا خدا کل کا سورج اپنی راہ بھول جاتا۔

میں نے اپنے گھر کا ایک بجٹ بنایا تھا، گزرے ہوئے دنوں کا بجٹ، اسے میں نے بنایا ہوگا، اسے ہم نے بنایا ہوگا، وہ کاغذ اسی طرح پیپر ویٹ کے نیچے دبا جانے کب سے سسکیاں لے رہا تھا۔ درآں حالے کہ نہ وقت کو قرار تھا نہ قیمتوں کو۔

ڈریسنگ ٹیبل پر ایک ادھ کھلا خط، کب آیا تھا یہ، صاف ستھرا سا خط، آخر کب آیا تھا یہ، میں اسے اٹھا کر دیکھتا ہوں، کتنے ہی دن گذر چکے تھے، میں اچھا ہوں، بہت سارے قصے، تم کیسے ہو! — تمہارا.....

وہ آج کیسا ہے، قصوں کی کتاب میں اور کتنے حصوں کا اضافہ ہوا؟ — اور میں — میں اب کیا کہوں؟ — میں نے خود سے کئی بار یہ سوال کیا اور ہر بار کنفیوژن کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اور پھر وہ تمہارا — پیار کے رشتوں کا شہر کتنا روشن کتنا آباد ہے، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دل کے نہاں خانوں میں جو کبھی کبھی ایک روشنی کا گمان ہوتا ہے وہ اسی شہر سے آتی ہے۔

وہ خواب بھی تازہ بہ تازہ رکھا ہوا تھا۔

دیوار پر تاریخوں کا ایک دفتر آباد تھا، وہیں جہاں میں چھوڑ گیا تھا، ایک مسکراتی ہوئی بہار کو اپنے جلو میں لئے۔ گرمی گئی، برسات گئی، سردی گئی، لیکن بہار پھر بہار تھی، نہ آگے بڑھی نہ پیچھے ہٹی، بس ایک کیف جاودانی بنی ٹھہری گئی تھی۔

بستر پر یہاں سے وہاں تک ایک کور بچھا تھا، صاف ستھرا، جس کے سرہانے ایک کتاب رکھی تھی، یہ کتاب شاید اس رات کی آخری رفیق تھی اور یوں وہ اپنے قبیلے سے کٹ گئی ہوگی جو الماری میں بستا ہے، کتاب بہت دنوں سے قبیلے سے الگ تھلگ تنہائی اور بن باس کا دکھ جھیل رہی تھی، فنا رنج کی ایک کتاب جس میں اسی کا

سمندر مقید ہے پھر مجھے تعجب ہے کہ دوسری کتابیں، دوسرے علوم کی کتابیں، الماری میں بند ہیں اور وہ اکیلی تواریخ ماضی کے دشت میں اپنا سفر ایک کنارے سے شروع کر کے دوسرے کنارے پر ختم کر دیتی ہے یکلخت ٹھہرا ہوا دریا۔

پنکھے کی طرف نظر دوڑائی تو وہ صاف ستھرا سر چمک رہا تھا، اس کے رُکے ہوئے بازوؤں نے مجھ سے کہا ــــ جیسے تم مجاور کہتے ہو وہ ہر صبح میرے جسم سے آلام کی گرد صاف کر دیتا تھا، میں نے سوچا کہ جب یہ گرد صاف کر دی جاتی ہے تو وقت کا فرق مٹ جاتا ہے اور وہ دن جس کے نقوش تک مٹ چکے ہیں بالکل کل کا، بالکل ہی کل کا دن معلوم ہونے لگتا ہے۔

سنو! میں نے ایک سات دیکھا کہ تمہارے دست و بازو جھکڑوں میں اُڑے جا رہے ہیں اور میں اس پلنگ پر ہوں جو تمہارے نیچے بچھا ہے، پھر ایسا ہوا کہ سارا منظر ہوا کے دوش پر تھا۔ بہت دیر بعد جب وہ پلنگ کہیں سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ میں اس پلنگ پر نہیں تھا اور تب میں خود کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔

ہماری گفتگو کو مجاور غور سے سن رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی پتھریلی چٹانوں پر لحظہ بھر کے لیے ایک کلی کھلی اور دوسری ہی ساعت وہ جل گئی ــــ

میز پر پانی کی بوتل رکھی تھی، مجاور نے کہا۔ مجھے تمہاری عادتیں معلوم تھیں، اس لیے میں ہر رات اس بوتل کو اچھی طرح دھو کر اس کا پانی بدل دیتا تھا، بوتل سے قریب ہی ایک چمکتا ہوا گلاس رکھا تھا۔

اس پانی کا مزہ ہی اور ہے، طوفان بردوش شہر والوں کے پانی میں تو دواؤں کا زہر ملا جاتا ہے۔

بچی جو دیوار پر کھڑی تھی یک لخت بول پڑی ــ انکل! دیر سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں، وہ اس کی صاف و شفاف مسکراہٹ ــــ بچی تصویر کے زنداں میں تھی، مگر وقت ــــ

باتھ روم میں ہر شے اسی طرح رکھی تھی۔ ایک چمکتا ہوا لوٹا، ایک پلاسٹک کا ٹمبلر، ہینگر پر ایک تولیہ، ایک خالی صابن دانی، دوسری صابن دانی میں ایک گھسا ہوا صابن، جس کے سینے پر ایک بڑا سا بال پیوست تھا۔

مجھے کچھ یاد آ گیا۔

اس شاور کے نیچے ہم دونوں ایک دوسرے میں گم تھے، ایک داستان اس شاور نے چھیڑ رکھی تھی، ایک ہم نے چھیڑ رکھی تھی اور وقت اپنے پیر پھیلائے شاید سو گیا تھا، باہر ایک گرم دوپہر تھی اور اندر غسل خانے میں ٹھنڈی پھواریں تھیں، حیات خنک بھی تھی، حیات لہو بھی تھی ــــ

اُڑتے ہوئے پرندے سمندر کی سوندھی خوشبوؤں کے ٹیلے اور نشیب پر ہلکی ہلکی دستکیں دیتا ہوا چڑھتا اور وقت مہربان وہیں اپنے پیر پھیلائے سویا تھا کہ اچانک تاریک رات کے سینے سے ایک چیخ بلند ہوئی، کالونی کا پہرے دار سیٹیاں بجاتا گھوم رہا تھا اور تب میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وقت کو خیر خواہ کہوں یا وقت کو بدخواہ کہوں۔

آئینے کی عمر وہیں رک گئی تھی، میں جب اس کے اندر اترا تو اس نے پوچھا وہ گمنامیں کہاں ہیں؟ تب ہی مجھے احساس ہوا کہ دل کے سموم میں سب کچھ جھلستا جا رہا ہے، میرا سینہ، میرا چہرہ، میرے ہونٹ اور میری آنکھیں۔

گھڑی ساڑھے چھ پر آ کر رک گئی تھی، یہ وقت کب آیا تھا، یہ صبح دم آیا تھا یا شام ڈھلے آیا تھا ——
پر گھڑی تو صرف ساڑھے چھ جانتی تھی۔

اور یہ کمرہ جس میں ہر شام گھونگھٹ ڈالے عروسی خوشبوئیں داخل ہوتی تھیں۔

میں نے مجاور سے کہا: میں اپنی روح یہیں چھوڑ گیا تھا، تم نے اسے بہت آرام پہنچایا —— میں تمہارا احسان ——

تب مجاور نے اپنے پتھریلے ہونٹوں کو جنبش دی —— تم بھی مجھ پر ایک احسان کرو، وعدہ کہ مجھے اس بات کی اجازت دے دو کہ میں اپنا جسم یہیں چھوڑ دوں اور اپنی روح لے کہیں اور چلا جاؤں —— تمہاری روح اس کمرے کی امانت رہے گی اور میرا جسم ——

۱۹۷۶ء

—— ✧ ——

وہ ایک شخص

پچھم، پورب، اتر، دکھن — غرض ہر سمت تمہارے تصور کی حدود تک تمہیں شہباز ہی شہباز ملے گا —

جَو کی روٹیاں اور گڑ کا ایک ٹکڑا —

اور مسجدم بھگوئے ہوئے چنے —

اطاعت خدا کی، اطاعت شہباز کی، یہ تمہاری سیکڑوں سال کی تاریخ ہے۔

تم جو کھیتوں میں ہل جوتتے ہو، بوائی کرتے ہو، سینچائی کرتے ہو اور کٹائی کرتے ہو۔

تمہارے حصے کی روٹیاں تمہیں مل جاتی ہیں۔ بقیہ کے متعلق سوچنا تمہارے دائرۂ فکر سے خارج ہے۔

یوں بھی تم جانتے ہو کہ اوپر خدا ہے اور نیچے خدا کا نائب شہباز —

تم اس کے بندے ہو۔ وہ تمہیں تمہارا رزق دیتا ہے — تم اس کے بیٹے ہو اس لئے وہ تمہیں تمہارے حصے کی روٹیاں عطا فرماتا ہے۔

شہباز کے قلمرو میں ایک سکہ وحدت کا اور دوسرا اس فکر کا چلتا تھا — کہتے ہیں فکر کا سکہ

قوی تر تھا۔

آبادی میں ایک مست نکل آیا۔

اس نے پوچھا کھیتوں میں گندم ہوتا ہے۔

مقصد؟ ——

تو وہ کہاں جاتا ہے وہ ہمارے حصے میں کیوں نہیں آتا؟

تمہارے باپ نے کبھی یہ سوال نہیں کیا تھا نہ ہی تمہارے دادا اور پر دادا نے ان فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کیا تھا ——

تم سچ کہتے ہو مگر میرے اندر سوالوں کا طوفان اٹھا کرتا ہے۔

دینی بزرگ کو خبر ملی، وہ اس کے گھر والوں سے کہہ گیا —— "مست گمراہ ہوتا جا رہا ہے" اسے گھر سے باہر نہ جانے دیا کرو، مبادا کوئی اس کی فصد کھول دے —— "

تب ہی آبادی کے ایک تعلیمی مرکز میں ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے سے پوچھا۔ "مست کی بات تم نے سنی —"

"ہاں میں بھی بہت سے سوالوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں —"

دوسروں نے کہا —— "یہ سب دماغی خلل ہے۔ خدا سب کچھ جانتا ہے اور شہباز اس کا نائب ہے" نہ وہ غلط نہ یہ غلط —— یہ سارے خیالات معاندانہ ہیں —— مست ایک بے راہ رو فرد ہے —"

کھیت پر دو مزدور محو گفتگو تھے۔

"مست نے یہ سوال بھری آبادی کے درمیان اُٹھایا تھا —"

خدا جانے مست کے یہ سوال کچھ معنی بھی رکھتے ہیں یا نہیں —"

"رکھتے ہیں کہنا بھی مشکل ہے اور نہیں رکھتے ہیں کہنا بھی مشکل ہے —"

پر یہ تھا کہ مست نے ایک ایسے تالاب میں جو دیر سے ساکت و صامت کھڑا تھا، چند ایک پتھر پھینک کر اس میں تحرک پیدا کر دیا تھا اور بے شمار لہریں اس کے سینے پر بیدار کر دی تھیں۔

مست گھر والوں کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا —— "میں تو شہباز سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا

ہوں۔ ظاہر ہے وہ ہماری اس سرزمین پر خدا کا نمائندہ ہے اور جو بات ہماری عقل کی گرفت میں نہ آتی ہو اسے خدا کا نمائندہ ہی حل کر سکتا ہے۔"

وہ آبادی میں گھوم گھوم کر لوگوں سے یہ دریافت کرتا رہا کہ کیا وہ جو ایک فکر کی رمق اس کے دماغ میں پیدا ہوئی ہے وہ اس سے واقف ہیں اور اگر واقف ہیں تو کیا وہ شہباز کے محل تک چل سکتے ہیں۔

دو طالب علم، دو کھیت مزدور ——————

محل کے دربان نے انھیں روکا۔ تب ہی کہیں سے شہباز کی آواز آئی ——————

"انھیں آنے دو" ———— وہ انھیں کہیں سے دیکھ رہا تھا۔

انھوں نے شہباز کو پہلی بار نزدیک سے دیکھا، اور دستور کے مطابق اسے سات بار کورنش بجا لائے اور نظریں نیچی کئے رہے۔

"ہوں ———— کیوں آئے" ————

مست نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— "نائب خدا! میرے دل میں ایک سوال دیر سے کانٹے چبھو رہا ہے"

"میں اس کانٹے کو نکال دوں گا ———— شہباز نے اس طور پر کہا جیسے وہ کانٹا اس کے اپنے دل میں آ چبھا ہو ————

"بیان کرو" ————

"ہمارے کھیت سرسبز و شاداب ہیں اور ان میں گیہوں ہوتا ہے۔ گیہوں کی روٹیاں موتی ہیں، پر......." ————

"تجھے یہ سب کس نے سکھایا" ——— شہباز دھاڑا۔

نائب خدا یہ باتیں تو ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں، جیسے چاند کا ابھرنا ڈوبنا خوں، صبح کی بدمست ہوائیں اور سر شام سورج کا شفق اور آسمان پر یہاں سے وہاں تک اس کے ہونی چھینٹیں۔

"تیرے باپ نے کبھی یہ سوال کیا، تیرے دادا نے، تیرے پردادا نے، تو کیا تاریخ کا ایک عجوبہ بن کر آیا ہے"

"اس سوال کا جواب نائب خدا ہی دے سکتا تھا اس لیے ......"

شہباز کی آنکھوں کے بھوبھرے کٹورے چھلک اُٹھے۔

"ان حرامزادوں کی مشکیں کسو"

مست چلایا۔ "لہلہاتے کھیت — گیہوں کی بالیاں — تنور میں گیہوں کی روٹیاں —"

"دیوانہ ہے ....."

پھر شہباز نے گرجتے ہوئے اپنے غلاموں کو حکم دیا۔ "ان نمک حرام سور کے بچے کو ننگا کر کے سامنے کے درخت میں الٹا لٹکا دو، تاکہ میں بھی یہ منظر دیکھ سکوں"

"چشم زدن میں یہ سب کچھ ہو گیا —"

"اب ان کی چوتڑوں پر سو سو درے مارو —"

محل کے پاسبانوں نے کبھی شہباز کو اس قدر برہم نہیں دیکھا تھا وہ سڑاپ سڑاپ درّے لگا رہے تھے —

وہ چاروں چیختے چیختے اور نالہ و شیون کرتے کرتے بیہوش ہو چکے تھے۔ ان کے جسم جا بجا پھٹ گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ جا بجا موٹی موٹی نیلی لکیریں کھنچ گئی تھیں۔

تب ہی شہباز نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا۔ "اُتار دو انہیں"

ان میں دو طالب علم تھے۔ شہباز نے دیکھا کہ ان کے ننگے جسم کی تازہ جھلیاں پھڑپھڑا رہی ہیں اور اُن پر تمام سبزہ ہی سبزہ اُگا ہے۔ ایسا کہ جانور اس پر منہ مارے۔

"ان دو چھوکروں کو تم میں سے جو چاہے اپنے گھر لے جائے اور انھیں اپنے تصرف میں رکھے اور اگر وہ آئندہ کبھی ایسی حرمزدگی کریں تو پھر انھیں جہنم واصل کر دے۔"

"یہ دو جو کھیتوں پر کام کرتے ہیں، ان کے سر مونڈ دیئے جائیں، ان کی زبانیں کاٹ دی جائیں اور انہیں خصی بنا کر سیاہ خرقہ دے دیا جائے۔ آج سے یہ محل کے اصطبل کے گھوڑوں کی لید صاف کریں گے۔"

اور یہ نطفۂ حرام اس نے مست کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں اسے معمولی موت نہیں دینا چاہتا۔ اسے تیس سال کے لئے اندھیرے مقبرے میں ڈال دو۔"

مست نے اندھے مقبرے کا نام سُنا تو ایک برقی رَو سی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسی دم مست کے اندر عرفان ذات کا عمل شروع ہو گیا ــــــ مجھے ایک سوال کرنا تھا، میں نے ایک سوال کر دیا۔ میرا کام ختم ہو گیا اور اس کام کے ساتھ ساتھ گویا میں بھی ختم ہو گیا پر یہ کہ میں نے چھینی سے پتھر پر ایک نقش بنانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ میری چھینی کے نشان رہ جائیں گے۔ یہ کام کوئی اور پورا کرے گا ــــ"

وہ دو طالب علم لبسا دئیے گئے۔ دو مزدور ایک کایا پلٹ کے بعد اصطبل میں لگا دئیے گئے اور مست ــــــ۔

اندھا مقبرہ مست سے پہلے کب آباد ہوا تھا، یہ کسی کو یاد نہیں تھا۔ محافظ جو مست کو کشاں کشاں اندھے مقبرے کی جانب لے جا رہے تھے، وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ وہ مقبرہ انہوں نے اپنے ہوش میں کبھی نہیں دیکھا، شاید ان کے پرکھوں نے دیکھا ہو یا ممکن ہے ان کے پرکھوں کے پرکھوں نے دیکھا ہو۔

ایک چھوٹی سی گول عمارت جو چاروں طرف سے بند تھی اور جس کے اندر سونے والا کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں سو سکتا تھا اور جس کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا مثلث باہر نکلا ہوا تھا۔

"یہ تمہارے بول و براز کے لئے ہے اس کی صفائی باہر سے ہو گی ــــ"

مقبرہ چھ سات فیٹ سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔

مست نے خون بھری آنکھوں سے اس مقبرے کو دیکھا۔ اسے زمین سے ملی ہوئی ایک ڈیڑھ دو فیٹ کی لوہے کی کھڑکی دکھائی دی جس میں ایک زنگ آلود قفل لگا تھا۔ مست نے سوچا مجھے ادھر ہی سے داخل کیا جائے گا ــــــ پھر ایک جگہ دیوار میں ایک چھوٹا سا شگاف نظر آیا۔ ایسا کہ اس میں دیدہ بھی نہ سما سکے۔ شاید سانس کا نظام قائم رکھنے کے لئے۔

اتنے ہی میں شہباز کا ایک ہرکارہ اس کے لئے ایک جانگھیا لے آیا۔ اس کی کمر کی رسی ڈھیلی کر دی گئی۔ "اب دوسری طرف جاؤ اور یہ جانگھیا پہن لو ــــ"

وہ ننگ دھڑنگ ایک ہاتھ میں پیرہن اور دوسرے میں پاجامہ لے کر آیا تو انھوں نے یہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "جب تم تیس سال کے بعد رہا ہو گے تو یہ پوشاک تمہیں واپس مل جائے گی ــــ"

مست کو چپ سی لگ گئی تھی۔ کیا بولے وہ۔۔۔ اسے تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وقت کا ایک دریا ہے جس کی میعاد تیس سال ہے۔ اس دریا میں لگا ہے وہ ڈوبتا ہے، لگتا ہے ابھرتا ہے، لگتا ہے ساحل سے لگ جاتا ہے، لگتا ہے ساحل سے دور ہو جاتا ہے۔ مکمل خود فراموشی کا دور ــــــــ

اس چٹیل اور دور دور تک پھیلے ہوئے میدان میں کسی ذی نفس کا پتہ تک نہیں تھا ــــــــ

تب ہی وہ چھوٹا سا زمین سے لگا ہوا ڈیڑھ دو فیٹ اونچا دروازہ سخت کوششوں کے بعد کھلا۔ قفل زنگ آلود ہو چکا تھا۔ انھوں نے اسے مٹی ڈال میں دے کر بڑی مشکلوں سے کھولا اور باری باری اپنے سر اس کے اندر ڈالے۔ اس میں وقت کی لاش کے سڑ گل جانے کی بدبو بسی ہوئی تھی ــــــــ

ان کے دل بھی رنج و غم سے آباد ہو گئے۔ مست آخر ان کی آبادی کا ایک فرد تھا، گھر بار بال بچوں اور خاندان والا ــــــ مگر چہرے بجھ گئے شاداب تھے۔ یہ ایک فن تھا جسے انھوں نے شہباز کے یہاں رہ کر سیکھا تھا ــــــــ

مست نے ایک سپاہی سے کہا۔ "میرے بچوں کا خیال رکھنا ـــ"

اس نے فی الفور اپنے بازو والے کو دیکھا ــــ لفنگے شہباز کے محل پر چڑھ آیا تھا۔ بھول گیا تھا اپنی اوقات ــــــ"

پھر وہ بیچ والے کے پاس گیا۔ اس نے دونوں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔

"جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے ـــــ"

اور کنارے والے نے کہا۔ "احمق انسان زمین کے سینے پر ایک بوجھ ہوتا ہے ـــ"

اس کے بعد مست نے خود کو بالکل ہی تنہا محسوس کرتے ہوئے، سامنے کے پھیلے ہوئے چٹیل میدانوں اور دور دور کے درختوں کو دیکھا جن سے پرے کھیت کھلیان تھے، لہلہاتی فصلیں تھیں اپنے جیسے لوگ، اپنا گھر، بال بچے اور شہباز ــــــــ

اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب دنیا چھوڑ رہا ہے اور یہ اندھا مقبرہ فی الواقع اس کا مقبرہ بن جائے گا۔ اور یہیں سے وہ قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ اپنے حساب کتاب کے ساتھ ــ تب ہی اس نے ایک ایسی آہ بھری جو اس وقت بھری جاتی ہے جب آدمی راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔

وہ اندر چلا گیا پھر اس نے زنگ آلود قفل کے بند ہونے کی آواز سنی —— اس ایک آواز کے ساتھ اس نے سوچا تین دہائیاں مقفل ہو گئیں۔

سپاہیوں کے بوٹ کی آواز دور اور دور ہوتی چلی گئی۔

اندھے مقبرے میں وقت کی سڑی لاش اور اندھیرے کا سیاہ خام، پسینے میں شرابور جسم مہک رہا تھا۔

دیوار کے شگاف پر نظر پڑی تو مست نے سوچا کہ یہی ایک چھوٹا سا شگاف ہے جو باہر کی دنیا سے اس کا رشتہ باقی رکھتا ہے۔ یہ ہے تو وہ اس دنیا کے ایک چھوٹے سے نقطہ کو دیکھ سکتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتا تو دنیا ختم ہو چکی ہوتی۔

مقبرے نے گردان شروع کی ——

"یہ ایک سکنڈ گذرا" مست کو یوں لگا جیسے کئی گھنٹے گذرے۔

یہ ایک منٹ گذرا —— کئی ایک دن ——

یہ ایک گھنٹہ گذرا —— کئی ایک ہفتے ——

یہ ایک دن گذرا —— کئی ایک سال گذرے ——

یہ ایک ہفتہ گذرا —— کئی ایک دہائیاں گذریں ——

یہ ایک مہینہ گذرا —— کئی ایک صدیاں گذر گئیں ——

مست نے سوچا کہ جب ایک سال گذر جائے گا تو اسے یہ احساس ہوگا کہ کئی ایک عالم گذر چکے ہیں ——

جب شام کے سائے سارے میں پھیل جاتے تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ میدان گنگنا رہا ہے پھر ایسا لگتا کسی قافلے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں لیکن جب غور کرتا تو وہ انسانی قدموں کی چاپ ہوتیں جو جلد ہی بوٹ کی دھمک میں تبدیل ہو جاتیں۔

اس ویرانے میں اسے بوٹ کی گھن گرج بھی اچھی ہی لگتی —— دراصل کسی ذی نفس کی قربت کا احساس ہی اس کے لئے بے حد خوش آئند ہوتا ——

"برت بہت کچھ کہہ دیتے ہیں، لیکن پھر سوچو کہ وہ ایک انسان کے پاؤں میں ہوتے ہیں۔"

پھر سناٹے کے جگر کو چیرتی ہوئی آواز آتی ___

مست ___ جو کی چار روٹیاں، گڑ کا ایک ٹکڑا، ایک موم بتی اور ایک مشکیزہ پانی۔ مست ان چیزوں کو ایک کونے میں رکھ دیتا ___

یہ روٹیاں چوبیس گھنٹے ساتھ دیں گی۔ یہ مشکیزہ بھی چوبیس گھنٹے چلے گا، بہو یا نہا ؤ۔ یہ موم بتی بس گھڑی دو گھڑی اور یہ دیا سلائی جس میں تیلیاں گن کر دی جاتی ہیں۔

ویسے روشنی کا یہاں کام ہی کیا ہے۔

دن کو وہ دیوار کے شگاف سے باہر کی دنیا کو دیکھتا۔ لق و دق میدان، گھنے درخت ___ مست کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ وہ میدان میں پھیلی ہوئی گھاس کے ایک ایک پتے کو گھنٹوں دیکھ سکتا تھا، وہ درخت کے ایک ایک پتے کو گن سکتا تھا۔ انھیں ہنستے، گنگناتے اور جھومتے دیکھ سکتا تھا اور ان تک اپنا پیغام بھی پہنچا سکتا تھا ___

"میں اس مقبرے میں محرومیوں کا شکار ہوں، اور تم ...."

اندھیرے اجالے کو دیکھ سکتے ہیں، لیکن اندھیرے اندھیرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ یوں دن کی خوشنما دنیا رات کو بڑے بڑے سیاہ دھبوں والی قبا زیب تن کر لیتی۔

دن گذر رہے تھے مگر اس طرح کہ جیسے ان پر گذرنے کا گمان تک نہ ہو۔ مست کچے فرش پر کچھ نشانات بناتا جس سے یہ پتہ چلتا کہ آج ایک دن گذرا، آج ایک ہفتہ گذرا، آج ایک مہینہ اور اور ...... پھر اس طرح مہ و سال کے گذرنے پر کنکریاں اکٹھا کرتا ___

تب یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ ایک منظر میدان کا، گھاس کی پتیوں کا، جھومتے درختوں کا، تالیاں بجاتے ہوئے پتوں کا، کھلے آسمان کا اور پھیلی ہوئی دھوپ کا بے معنی سا ہونے لگا اور اسے یہ محسوس ہوا کہ جب وہ ان کی طرف دیکھتا ہے تو وہ دم سادھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، کوئی کچھ نہیں بولتا، کوئی کچھ نہیں سنتا۔

مست کو یہ احساس ہوا کہ یہ سارے مناظر اس وقت خوشنما لگتے ہیں جب وہ آدمیوں کے درمیان رہتے ہیں یعنی ان کا حسن ایک اضافی شے ہے۔

اس دن عمر کی ایک نئی لہر نے اس کے دل پر حملہ کیا۔ جب کچھ نہیں تو پھر میں زندہ کیوں ہوں۔ میرا کیا حاصل ہے۔ یہ مقبرہ زندوں کا مقبرہ کیوں کہلاتا ہے ــــ

اُمس، گھٹن، پسینے کی تہہ در تہہ پرت ــــ مگر پانی صرف ایک مشکیزہ جسے چلّو میں لے کر کبھی وہ اپنے سر پر تھپتھپا لیتا اور کبھی سینے اور بازوؤں پر مل لیتا۔

ایک رات پہرے دار آیا تو مست نے اس سے دریافت کیا۔

"پانی کچھ اور مل سکتا ہے ــ"

دوسرے دن یہ خبر ملی کہ شہباز کی سالگرہ کے دن ایک فاضل مشکیزہ ملے گا۔

مست کا جی خوش ہو گیا۔

اتنے میں مست نے حساب کیا تو سردیوں کے دن قریب آ گئے تھے۔ دوسرے دن اس کی تصدیق یوں ہو گئی کہ اس کے لئے دو کمبل آ گئے ــــــ

اس مقبرے میں مست کبھی کبھی چیخ اٹھتا ــــ

"کیا حاصل اس زندگی کا۔ یہاں سے اگر زندہ نہیں نکل سکتے تو مر ہی کر نکل جائیں ــــ"

اس مسئلہ پر اس نے بہت غور کیا اور آخر میں یہ ترکیب سوجھی کہ خود کو کمبل میں لپیٹ کر کمبل کو موم بتی کی لَو دکھا دی جائے ــــ

لیکن پھر کئی نتیجے سامنے آئے ــــ "اگر صرف آدھا سودھا کمبل جلا اور میں نہیں جلا تو پھر دوسرا کمبل کہاں سے آئے گا ــ"

"اگر جسم پر صرف زخم آئے اور میں مرنے سے بچ گیا تو پھر زخم کے لئے مرہم کہاں سے آئے گا۔"

"اور اگر میں جل کر اس زندگی سے آزاد ہو گیا تو پھر میری لاش ننگی ہو جائے گی۔"

"وہ میری ننگی لاش کی تشہیر کریں گے ــــ نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا ــــ"

لیکن تب ہی بہت سے سرد سال، بھیانک تنہائیاں، لرزہ خیز بیزاریاں اس کی ہمت کے سینے پر بہت سی برچھیاں گھونپ جاتیں ــــ وہ تڑپ جاتا اور ایک ایک کو لٹکاتا جاتا۔

"چلو یونہی سہی ــــــ"

ایک شام پہرے دار کھانا اور پانی کا مشکیزہ لے کر آیا تو مست نے اس سے کہا۔ "جی نہیں لگتا، کوئی کام بتاؤ۔"

پہرے دار کچھ نہیں بولا — لیکن دوسرے دن جب وہ کھانا اور پانی کا مشکیزہ لے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا —

مست نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اور جب مست نے تھیلا کھولا تو اس میں مرمت طلب جوتے تھے ساتھ میں ایک سُوا، موٹے دھاگے کی ریل اور موم کا ایک ٹکڑا رکھا تھا۔ مست کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اس نے ایک جوتا کھینچ مارا۔ لیکن تب تک پہرے دار اس کھڑکی کو بند کر چکا تھا۔

دیر تک مست کے سر پر ایک جوتے خوں سی سوار رہی، دیر تک آنکھیں لہو میں ڈوبی رہیں، دیر تک اس کے دل میں طوفانی موجیں اٹھتی رہیں اور دیر تک اس کے بازو میں سنسناہٹ سی رہی —

اس دن جب یہ بلاخیز موسم گذر گیا، تو ایک بار پھر اس کا جی چاہا کہ اپنے جسم پر کمبل لپیٹ کر اسے نذر آتش کر دے لیکن یہ خواہش پھر سارے بھیانک نتیجوں کے ساتھ سامنے آئی اور بالآخر اسے ایک نیا ادراک حاصل ہوا کہ انسان کو ہر حال میں اپنے پیاروں کے لئے جینا چاہئے —

اس رات جب مست سویا تو اس نے خواب دیکھا کہ ایک بے حد گھنا جنگل ہے کہ نہ اس کی مغرب میں کوئی انتہا ہے نہ مشرق میں اور نہ ہی شمال اور جنوب میں، ایسا گھنا جنگل کہ آسمان سے زمین کی سیڑھیاں بھی اس میں سما نہیں سکتیں، اس واسطے اس میں نہ دن کا آفتاب اترتا ہے اور نہ ہی رات کے ماہتاب کے داخل ہونے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ مست دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے؟ تب اسے کہیں سے ایک کلہاڑی مل گئی اور وہ ایک درخت پر چڑھ کر اس کی ڈالیاں کاٹنے لگا۔ اس امید پر کہ اگر اس نے کسی طرح اس گھنے جنگل کو کاٹ ڈالا تو شاید آسمان اپنے زینے لگا کر آفتاب اور ماہتاب کو وہاں بھیج دے۔

تب دوسرے دن پھٹے جوتوں کا ایک اور بنڈل آیا۔ پہرے دار نے دیکھا کہ پہلا بنڈل اسی طرح رکھا ہے اس نے اس پہلے بنڈل پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اور کھڑکی بند کر کے چلا گیا۔

صبح اُٹھ کر مست نے جوتوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ پھر سُوا لے کر اسے موم کے جگر میں پیوست کیا، اس طرح

اس کا آہن کچھ سرد ہوا اور پھر اچانک آپ ہی آپ جوتے سینے لگا۔ کسی کا منہ کھُلا ہوا تھا، کسی کی زبان باہر نکل آئی تھی اور کسی کے پہلو میں نیزے کی ایک دھار لگ گئی تھی۔

تمام دن وہ سر جھکائے جوتے گانٹھتا رہا اور جب دیوار کا شگاف اندھیرا لانے لگا تو اس نے موم بتی روشن کر دی اور ایک نظر اس جوتے کے ڈھیر پہ دوڑائی، جنھیں وہ سی چکا تھا۔

کسی نے سرگوشیوں میں اس سے پوچھا۔ "کسان کا بچہ جب جوتے گانٹھنے لگے تو کیا ہوتا ہے؟"

اس کا جواب وہ کیا دیتا۔ کچھ عجیب سی بوکھلاہٹ میں اس نے آواز کو 'ہاں' 'ہوں' میں ٹال دیا۔۔۔

شام کو جب پہرے دار آیا تو مست نے کہا۔ "یہ سلے جوتے لیتے جاؤ، اور اب سے میرے لئے دو مشکیزے پانی لایا کرو، مجھے اس کام کے بعد ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔"

اب اسے شگاف سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ وہ ہوتا اور جوتے ہوتے۔ ان جوتوں میں وقت کے قدم ہیں جو آگے ہی بڑھنا جانتے ہیں۔۔۔

آگے اور آگے۔۔۔

تب ایک دن، اس نے محسوس کیا کہ پہرے دار بدل گیا۔ اس نے اس تبدیلی پر کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ اسے سرِ شام جو کی روٹیاں، گڑ کے ڈھیلے اور دو مشکیزے پانی مل جاتا تھا اسے زندہ رکھنے کے لئے۔ اور پھٹے جوتوں کا ایک گٹھر وقت کو تیز خرام بنانے کے لئے۔۔۔

کب صبح ہوئی، کب دوپہر، کب شام اور کب رات۔۔۔

اس کی دنیا جوتوں کے ڈھیر میں کھو گئی تھی۔ وہ وقت کے جوتے بنانے میں منہمک تھا اور وقت تھا کہ اس نے اس کے سر کی سرسبز فصل کو جلا کر خاک کر دیا تھا اور اب اس خاک کو بھی کہیں اڑا لے گیا تھا۔۔۔ اس کے ننگے سر پر سیل کے سیاہ دھبے پڑ گئے تھے، جنھیں مست دیکھ نہیں سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔

گردن جھکائے جھکائے وہ خود بھی کافی جھک گیا تھا۔ اسے اکثر دن میں بھی موم بتی جلانی پڑتی تھی۔ اب یہ دستور ہو گیا تھا کہ شام کو جب پہرے دار آتا تو مست پہلے اس کے اس ہاتھ کو دیکھتا جس میں پھٹے پرانے جوتوں کا بنڈل ہوتا۔

پھر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ جوتے گانٹھتے وقت آنکھوں کو چاروں سمت سے سمیٹنا پڑتا ہے۔

کئی پہرے دار بدلے، کئی زمانے بدلے —

بیرونی دنیا کے آئینہ خانے تو کب کے تاراج ہو چکے تھے اب ایک اندرونی دنیا کا آئینہ خانہ تھا جس میں کبھی کبھار صورت و رنگ کی جلوہ گری ہوتی لیکن زمانہ انھیں بھی تیزی سے مدھم کرتا جا رہا تھا صورتیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں، رنگ اپنی چمک دمک کھوتے جا رہے تھے —

تب ایک دن پہرے دار دن کو پہنچ گیا اس کی رہائی کا پروانہ لے کر —

لیکن مست پر اس خبر کا کوئی ردعمل نہیں ہوا، بلکہ اس وقت بھی اس نے پہرے دار سے وہی ایک سوال کیا — "جوتے نہیں لائے۔"

اب جس نے زندگی کے تیس سال دو قدموں کی دنیا میں گذار دیئے تھے، جس نے تین دہائیوں کے پھیلے ہوئے عہد کو دیوار کے ایک چھوٹے سے شگاف کے جلوے میں سمیٹ لیا تھا، اسے پھر ان گنت قدموں کی دنیا، بے شمار جلووں میں بکھری ہوئی دنیا میں واپس جانا تھا —

سب سے پہلا وار تو اس پر چمکتے سورج کا ہوا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی آنکھیں اس تیز روشنی میں جھلس گئیں اس کا سر چکرا گیا اور وہ کچھ دیر کے لئے زمین پر بیٹھ رہا —

پھر جب ذرا یہ کیفیت کم ہوئی، تو وہ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا پہرے دار کے پیچھے لگ گیا —

چٹیل میدانوں کی راہ ختم ہوئی تو آبادی آئی۔ خاموش تماشائیوں نے اس مست کو دیکھا جس کی نگاہوں کا آہو کسی اور دشت کو نکل چکا تھا۔ جس کے جسم کی مچھلیاں خشکی پر آکر بس کوئی دم کی مہمان تھیں۔ جس کے جسم میں خون کا دریا منجمد دکھائی دیتا تھا اور جس کے چہرے پر تین دہائیوں کی خاک کی موٹی موٹی تہیں جم گئی تھیں —

بہت کمزور سا، بہت نحیف سا —

آبادیوں میں پہنچ کر اس نے پہرے دار سے پوچھا — "کہاں —؟"

"محل تک —" ایک مختصر سا جواب تھا۔

محل کے سامنے میدان میں خلقت کا اژدہام تھا۔ پہرے دار نے اسے صدر میں پہنچا دیا جہاں اسے شہباز نظر آیا —

شہباز کو دیکھ کر اسے ایک پرانا سبق یاد آ گیا۔ اور ایک اضطراری حالت میں وہ سات بار جھک کر کورنش بجا لایا ــــــ

شہباز کے باب میں بھی عمر کا سمند تھک چکا تھا، چہرے پر جھریاں تھیں، سُرخی ایسی تھی جو تڑ پیا ترک کر چکی تھی اور نگاہوں کی تابندگی ایسی جو چوکڑیاں لگانا بھول چکی تھی۔

شہباز نے اسے دیکھ کر کہا۔ "او مست، دیکھو میری رعایا تم سے ملنے کے لئے یہاں جمع ہوئی ہے ــ"

وہ آنکھیں جن کا آہوئے رمیدہ کسی اور سمت کو نکل چکا تھا بس ایک منظر پر جا کر جم گئی تھیں، کہ ایک کثیر مجمع ہے جو حاکم وقت کے حضور میں خاموش خاموش سا کھڑا ہے اور یوں لگتا ہے کہ بس اب کچھ ہونے والا ہے، تب ہی ان یخ بستہ آنکھوں نے دیکھا کہ سیاہ خرقے میں ایک شخص کھڑا ہے ــــ تاریخ کا ایک ورق بنا ــــ

اتنے میں شہباز نے اعلان کیا۔ "میرے بچو! یہ مست ہے تیس برسوں بعد آبادی میں واپس آیا ہے۔ تم اس کی باتیں سنو۔"

کوئی ردِ عمل نہیں، کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں ــــ

پہرے دار نے مست کو اسٹیج کے کنارے لے جا کر کھڑا کر دیا ــــ

وہ دیر تک چپ چاپ انہیں تکتا رہا۔

اس پر شہباز نے گلا صاف کر کے کہا۔ "مست! دیکھو یہ لوگ تمہیں سننے آئے ہیں۔"

پہرے دار نے بھی اسے ٹھوکا دیا ــــ

مست بول اٹھا ــــ "جوتا۔ دھاگہ۔ سُوا۔ موم۔"

پھر وہ چپ ہو گیا ــــ

کسی نے کہا "آگے بڑھو۔"

مست نے پھر وہی فقرہ دہرایا۔ "جوتا۔ دھاگہ۔ سُوا اور موم ــ"

آواز آئی۔ "یہ گیارٹ لگا رکھی ہے، آگے بڑھو۔"

مَست نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "جوتا۔ دھاگہ۔ سُوا اور موم۔"

"کیا بکواس لگا رکھی ہے؟"

تب ہی ایک جوتا اس کے سر پر آگرا اور پھر کئی ایک جوتے۔

شہباز کا چہرہ چمک اُٹھا، اس نے کھڑے ہو کر خلقت کو خطاب کیا۔

"میرے بچو! یہی وہ تھا جو کبھی سرسبز و شاداب کھیت، گیہوں اور گیہوں کی روٹی کی رٹ لگایا کرتا تھا

آج جوتا۔ دھاگہ، سُوا اور موم کی رٹ لگا رہا ہے۔"

"اِسے معاف کردو ــــ یہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔"

۱۹۷۷ء

ــــــــ ⁛ ــــــــ